کلام اقبالؔ

کے روحانی، فکری اور فنّی سرچشمے

پروفیسر مرغوبؔ بانہالی

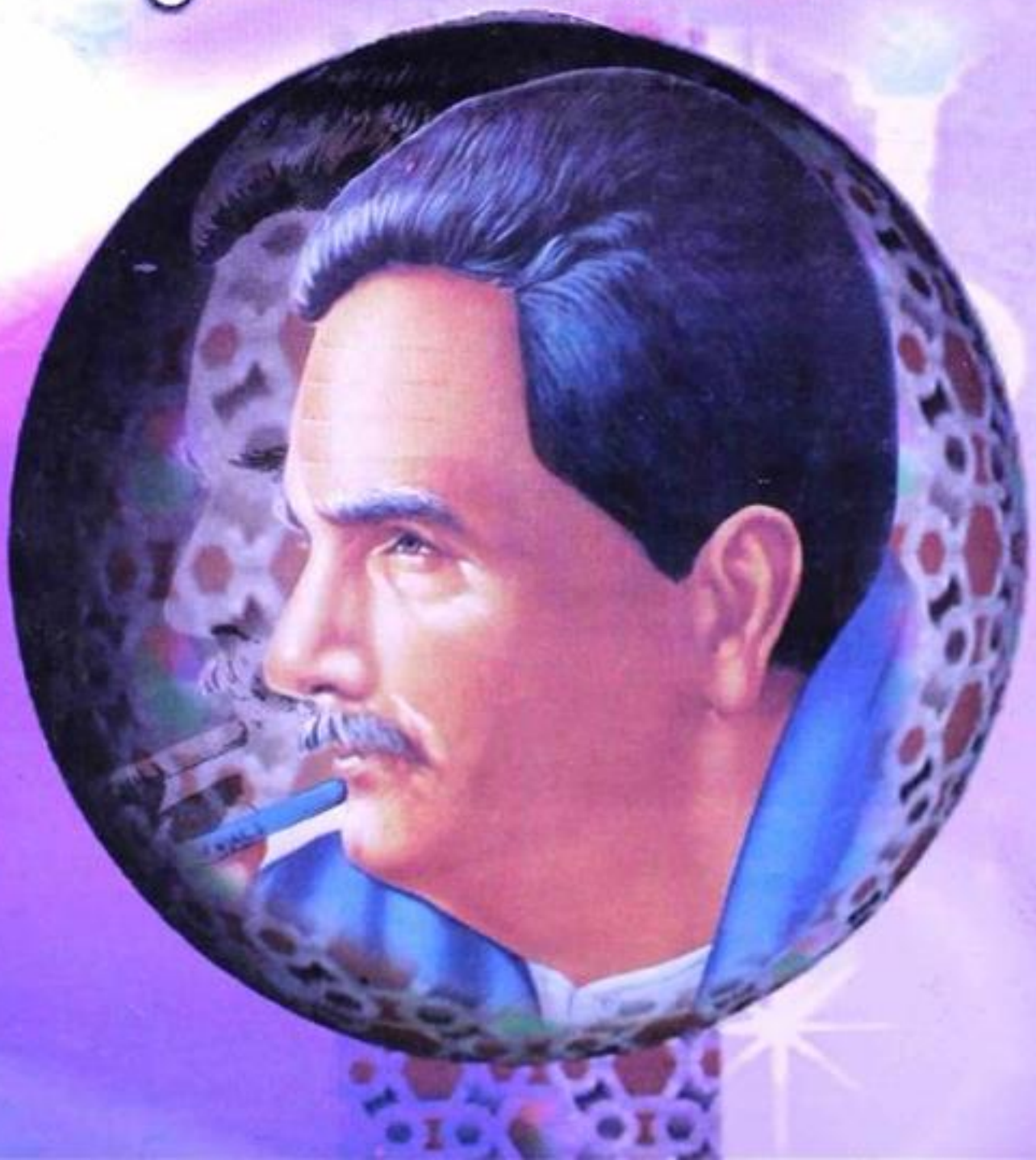

کلامِ اقبالؒ کے

رُوحانی، فِکری اور فنّی سرچشمے

پروفیسر مرغوب بانہالی

ناشر

وَجاہت پبلیکیشنز

بالمقابل یونیورسٹی گیٹ، مولانا فاروق لین، حضرت بل سرینگر

©جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

نام کتاب : کلامِ اقبالؒ کے روحانی، فکری اور فنی سرچشمے

مصنف : پروفیسر مرغوب بانہالی

باراوّل : 2004ء

سائز : 23x16 / 8

صفحات : 184

کمپوٹر کمپوزنگ : TFCسنٹر، مدینہ چوک، سرینگر 2473818

سرورق ڈیزائن : TFCسنٹر

طباعت : الحیات پرنٹوگرافرس، مدینہ چوک سرینگر 2473818

قیمت : 300/ روپے

تعداد : 500 (پانچ سو) پا24

ناشر

وَجاهت پبلیکشنز

بالمقابل یونیورسٹی گیٹ، مولانا فاروق لین حضرت بل سرینگر

فہرست

شمار	عنوان	صفحہ
☆	انتساب	3
☆	حرفِ تبریک (از: پروفیسر بشیر احمد نحوی)	5
☆	پیش لفظ...از مصنف	7
1.	قرآنِ حکیم، اقبالؒ کے عقائد و افکار کا عظیم ترین سرچشمہ	11
2.	قرآنِ حکیم کو حقیقی آبِ حیات جاننے والا دیدہ ور، اقبالؒ	39
3.	فارسی نعتیہ ادب ، اقبالؒ کو حجازی لے سے نوازنے والے سوز و ساز کا ممتاز سرچشمہ	58
4.	اقبالؒ اور مولانا رومیؒ	77
5.	اقبالؒ اور سعدیؒ	92
6.	اقبالؒ اور امام غزالیؒ	105
7.	اقبالؒ اور حافظ شیرازیؒ	110
8. I	اقبالؒ اور شاہِ ہمدانؒ	114
II	شاہِ ہمدان کے شعری مجموعے	133
9.	اقبالؒ اور غنی کشمیری	140
10.	اقبالؒ اور مرزا غالبؔ	145
11.	اقبالؒ کے ایک ایرانی عاشق.....علی شریعتی	149
12.	اقبالؒ کے ایک کشمیری عاشق.....کا حاصلِ مطالعہ	165

◆◆◆

انتساب

اپنے اوّلین شفیق اُستاد اور مرحوم والدِ نسبتی
الحاج مولانا غلام احمد بنکوٹی کے نام
جنہوں نے کم عمری میں ہی مجھے قرآنِ حکیم کے
فوراً بعد گلستان اور بوستان جیسی شہکار فارسی کتابوں
کے علاوہ مثنوی مولانا روم کا بیشتر حصّہ بھی بدرس پڑھایا
تھا اور یہ نکتہ بخوبی فہم کرایا تھا کہ مُسلمانوں کے عالمگیر زوال
کا ایک بُنیادی سبب قرآن واحادیث کے تئیں اُن کی
غفلت ہے۔ میرے یہ پوچھنے پر کہ اب اِس بیماری کا
علاج کیا ہے؟ تو وہ بڑے اعتماد سے بولے تھے کہ نئی نسل کی
تعلیم وتربیت میں اُنہیں مولانا رومی کے اِس مشورے
پر پُوری سنجیدگی سے عمل کرنا چاہیے:-

؎ دستِ ہر نا اہل بیمارت کُند
سوئے مادر آکہ تیمارت کُند

ترجمہ: تمہیں ہر پرائی پرورش اور تربیت کئی طرح کی بیماریوں میں مُبتلا کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔ اس لیے عینِ وقت پر اپنی شفیق ماں کی اہمیت سمجھ لو، اُسی کے زیرِ سایہ تمہیں روحانی، ذہنی اور جسمانی صحت کی ضمانت مل سکتی ہے۔

◆◆◆

حرفِ تبریک

باسمہٖ تعالیٰ

یہ میرے لیے اِنتہائی مُسرت کا موقعہ ہے کہ مجھے ایک باوقار اور باغ و بہار شخصیت کی کتاب پر چند تعارفی الفاظ تحریر کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے، جو کشمیر یونیورسٹی میں شروع سے لیکر آج تک میرے لیے حوصلہ افزائی کے پُر خلوص کلمات ادا کرتے رہے ہیں ۔ بلکہ جو اقبال اکیڈمی کشمیر کے پروگرام کو آگے بڑھانے میں بھی مجھے ہر قدم پر اپنے مُشفقانہ تعاون سے نوازتے رہے ہیں پھر جب یونیورسٹی میں بحیثیت ایڈہاک لیکچرر کے آج سے سولہ سال پہلے میرا تقرر ہوا، تو اس وقت بھی جنہوں نے میرے ماتھے کو بوسہ دیکر نوازا اور بعد میں بھی جو میری ترقی کے ہر مرحلے پر کبھی تحریراً اور کبھی زبانی مبارکباد پیش کرتے رہے۔ وہ شخصیت ہیں، واجبُ الاحترام پروفیسر مرغوب بانہالی۔ بانہال کے کوہستانی خطّے سے لے کر ٹیٹوال کے میدانی علاقوں تک کشمیر کا ہر ادب نواز، اسلام پسند اور تعمیراتی شعر و ادب سے وارفتگی رکھنے والا، مرغوب صاحب کی ذات اور اخلاص و محبت سے نہ صرف متاثر ہے بلکہ آپ کے مخالفین بھی اپنی نجی محفلوں میں مرغوب صاحب کی پاکیزگی، پاک دامنی اور دلنوازی کے معترف ہیں ۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کوہستانی

زیرِ نظر کتاب ''کلامِ اقبال کے روحانی، فکری اور فنی سرچشمے''

مختلف مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مرغوب صاحب نے یونیورسٹی میں منعقدہ سمیناروں یا دیگر محفلوں میں پیش کیے ہیں۔ جہاں تک راقم الحروف کے مطالعہ کا تعلق ہے ان موضوعات پر درجنوں، ماہرین اقبالیات نے شرح وبسط کے ساتھ اپنے خیالات اور معلومات کا اظہار کیا ہے، لیکن یہاں جو بات مرغوب صاحب کو ان ماہرینِ ادب سے ممیّز کرتی ہے وہ ان کا علامہ اقبال کے فکری اور روحانی سرچشموں بالخصوص فارسی ادب سے ان کی براہِ راست واقفیت ہے اور پھر عقیدت و اِرادت کے جذبات سے مُزیّن آپ کا اندازِ تحریر بھی مضامین کے حُسن کو دوبالا کرتا ہے۔ علامہ اقبال کا ملتِ اسلامیہ کی بیداری میں جو حصّہ ہے مرغوب صاحب اس پر تفصیلاً اظہارِ خیال کرتے ہیں اور اُس رفیع الشان کلام کو خراج تحسین کے پھول نچھاور کرتے ہیں، جو کلام، قرآن کے لافانی اصولوں کی ترجمانی، اور نبی رحمت ﷺ کی ذات بابرکات سے عشق وعقیدت کی عکاسی کرتا ہے۔

مجموعی طور پر جو تاثر مرغوب صاحب کی کتاب کے مطالعہ سے قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اقبال ایشیائی مسلمانوں کے اضطراب کی آواز عالمگیر انسانی قدروں کی بازیافت، حرم کی پاسبانی اور ہر شب کو نورانی سحر میں تبدیل کرنے کی ایک طاقتور علامت ہیں۔

توقع ہے کہ مرغوب صاحب کی ان تحاریر کو علمی اور ادبی حلقوں میں قبولیت اور پذیرائی حاصل ہوگی۔

پروفیسر بشیر احمد نحوی
ڈائریکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی

◆◆◆

پیش لفظ

کلامِ اقبال کی بُلند آہنگی اور حلاوت و نفاست کی پُشت پر کن سرچشموں کی معرفت کارفرما رہی ہے اُن کا عرفان و ادراک اپنی تہذیب و ثقافت اور اپنی ہمہ گیر شناخت کی معرفت چاہنے والوں کے لیے از بس ضروری ہے لیکن ایک پیش لفظ کی محدود سی گنجائش کو ملحوظ رکھ کر ہم یہاں پر اس ضمن میں صرف علامہ اقبال کے کلیدی موضوع ''خودی'' کے حوالے سے ایک بنیادی سرچشمے ''قرآنِ حکیم'' کے متعلق مختلف اقبال شناس علماء کی آراء کا عکس ابھارنے پر ہی اکتفا کریں گے۔ وہ بھی صرف اقبال کی اولین معرکتہ الآرا تصنیف کے دائرے میں رہ کر۔

''اسرارِ خودی'' اقبال کی وہ اولین معرکتہ الآرا تصنیف تھی جس نے چھپتے ہی مشرق و مغرب میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔ ۱۹۱۴ء کے دوران اِشاعت پذیر ہوگئی ہوئی اس کتاب میں یورپ میں بڑے پیمانے پر پذیرائی اور سراہنا کرنے والے مغربی عالموں اور مستشرقوں میں جہاں پروفیسر نِکلسن کا نام سرفہرست رہا ہے وہاں نِکلسن کا ہم خیال اور مداح ہربرٹ ریڈ بھی ایک اہم نقاد رہا ہے۔ موصوف نے ۱۹۲۱ء میں اپنے ہم عصر عالمی شاعروں خصوصاً اپنے اِنگلستانی شاعروں کا تمسخر اُڑاتے ہوئے اقبال کو قابلِ رشک ہی نہیں بلکہ لائقِ تقلید شاعر قرار دیتے ہوئے لکھا تھا کہ ''اگر آج کے اپنے شعراء کی پرکھ کی جائے تو مجھے صرف ایک ہی ایسا زندہ شاعر نظر آتا ہے جو کم عیار ثابت نہ ہوگا اور یہ بھی طے ہے کہ وہ ہمارے عقیدے اور نسل کا شاعر بھی نہیں ہے۔ میری مراد محمد اقبال سے ہے۔ جس کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' کا ترجمہ حال ہی میں فارسی سے ڈاکٹر رینالڈ نِکلسن نے کیا ہے اور جسے میسرز میکمیلن نے طبع کیا ہے۔ آج جب کہ ہمارے مقامی (برطانوی) مُتشاعرا اپنے بے تکلف احباب کے حلقے میں بیٹھے کیٹس کے تتبع میں کُتے بلیوں اور ایسے ہی گھریلوں موضوعات پر طبع آزمائی کر رہے ہیں تو ایسے میں لاہور میں ایسی نظم تخلیق کی گئی ہے جس کے بارے میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس نے مسلمانوں کی نوجوان نسل میں طوفان برپا کر دیا ہے۔''

ایک عیسائی عالم ہوکر ہربرٹ ریڈ کا اقبال کی فکر و نظر کو یوں سراہنا دراصل مسلمان

ہونے کے باوجود اقبال کا دِل تمام قوموں کے لیے دردمندی سے معمور ہونے اور عالمِ انسانیت کو امن وسکون سے ہمکنار دیکھنے کی تمنا کے تحت سب سے زیادہ بیقرار ہونے کا ثبوت ہے۔ اسی تناظر میں ایران کا ملک الشعراء آقای محمد تقی بہار کہہ اٹھا ہے کہ ہماری صدی اقبال کی صدی کہلانے کے لائق ہے کیونکہ اس میں اقبال کی عبقری شخصیت اور جذبۂ تعمیرِ انسانیت سے پھوٹنے والی روشنی دُور دُور تک پھیل گئی ہے۔ ہربرٹ ریڈ کا یہ بیان بھی اس ضمن میں قابلِ توجہ ہے: ''میرا عقیدہ ہے کہ شاعر کی شخصیت کی مکمل تفہیم سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ شاعری کی تحسین کے لیے بہترین اساس کی حیثیت رکھتی ہیں۔ (بشکریہ ڈاکٹر سلیم اختر: تخلیق، تخلیقی شخصیات اور تنقید، ص ۸۸۹)

اقبال جیسے نابغۂ عصر اور عہد ساز شاعر کی شخصیت کی مکمل تفہیم کا بنیادی تقاضا کلام اقبال کے روحانی، فکری اور فنی سرچشموں کی تفہیم ہے۔ جب تک ہم بیسویں صدی کے اس عظیم خدا آگاہ قلندر اور خودی کے عظیم ترجمان کی شاعری کے سرچشموں تک رسائی حاصل نہ کریں گے ہمارا ہر اقبال شناسی کا دعویٰ معنوی سطح پر اُسی طرح کھوکھلا رہے گا جس طرح گذشتہ چھ صدیوں کے دوران برصغیر کی سب سے بڑی ثقافتی اہمیت کی زبان اور اقبال کی سب سے بڑا ذریعہ اظہار بنی ہوئی زبان ''فارسی'' سے ناآشنا کسی بھی شخص کی اقبال شناسی کا دعویٰ کھوکھلا قرار دیا جا سکتا ہے اور تو اور ایسا شخص اقبال کے شعری موضوعات میں شہہ موضوع کا درجہ رکھنے والے خودی لفظ کا منفی اور مثبت مفہوم بھی پوری طرح نشاندہی میں نہ لا سکے گا پھر ایسے شہہ موضوع کا سرچشمہ دریافت کرنا ایسے شخص کے لیے ناممکنات میں سے ہوگا۔ ناچار اسے بعض عربی اور فارسی علماء کی طرف رجوع کرنا پڑے گا خواہ اسے خود اقبال کے ایسے نثری بیانات بھی یونہی میسر ہو جائیں جو خودی کے سرچشمے سے متعلق ہوں مثلاً پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اسرارِ خودی کی شرح میں اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ ''غالباً ۱۹۳۰ کا واقعہ ہے جو میں نے ایک دن حضرتِ علامہ سے دریافت کیا کہ آپ کے فلسفۂ خودی کی قرآنی بنیاد کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ۱۹۱۱ء میں جب میں نے قرآن کی اس آیت میں تدبر کیا ''یا ایھا الذین اٰمنوا علیکم انفسکم الخ تو یہ حقیقت مجھ پر آشکار ہوگئی کہ ہر مسلمان پر اپنی خودی کا اِستحکام فرض ہے پس میں نے اسی آیت شریفہ کو فلسفۂ خودی کا سنگِ بنیاد بنایا۔''

(اسرارِ خودی معہ شرح، ص ۱۳۱۔ ۱۳۲)

اس اقتباس کی روشنی میں خودی کے استحکام کی بات روشن تر بنانے کے لیے کلامِ اقبال میں موجود مختلف آیاتِ قرآنی کی تفہیم از بس ضروری ہے مثلاً ''اِلّا بُسلطان '' اور ''یاقوی '' جیسے الفاظ کی حامل آیاتِ بینات، جن کے حوالے سے اقبال نے ایسے شعر تخلیق کیے ہیں

نکتہَ '' اِلّا بسُلطان '' یاد گیر ورنہ چون مور و ملخ در گِل بمیر
اہلِ قُوت شوز وِردِ '' یا قوی '' تا سوارِ اُشترِ خاکی شوی

جب کسی کو ایسے اشعار کے سرچشموں تک واجبی رسائی حاصل ہو جائے گی تب ہی وہ ڈاکٹر عبدالشکور احسن جیسے اقبال شناس کی ایسی گُل افشانیٔ گفتار سے محظوظ و مستفید ہو سکے گا کہ '' اپنا اظہار خودی کی فطرت ہے اور وہ تخلیق کے لیے بیتاب رہتی ہے وہ اپنے اثبات کے لیے نئے نئے پیکر بناتی ہے اور اُن غیر خود پیکروں سے ٹکرا کر اپنی قوت کا اہتمام کرتی ہے۔ غیر خودی سے آویزش کو شاعر نے لذتِ پیکار کا نام دیا ہے جس سے خودی کی قوت جلا پاتی ہے'' قوت '' خودی کا جوہر ہے۔ نظامِ حیات کا دارومدار خودی کی قوت پر ہے اس لیے زندگی کی عظمت قوت ہی کی رہینِ منت ہے۔''

(اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ص ۲۴)

عظیم سرچشمے سے ملی ہوئی بصیرت اقبال کو تنگ نظر یا کوتاہ بین نہیں بننے دیتی۔ وہ کھلی نظر سے یہ حقیقت پہچان لیتا ہے کہ ایک قطرہ قوتِ خودی سے اپنی تنک مایہ ہستی کو گوہر آباد میں تبدیل کر سکتا ہے لیکن اگر ایک پہاڑ بھی اپنی خودی سے بے بہرہ ہو گیا تو صحرا میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ روشن سرچشمے کے فیض سے اقبال پر یہ بات بھی روشن ہو جاتی ہے کہ اگر باطل بھی فی زمانہ قوتِ خودی حاصل کر لے تو وہ بھی وقتی طور پر اپنی بڑائی منوا سکتا ہے۔ چنانچہ اقبال اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرنے سے بھی نہیں شرماتے کہ

باطل از قُوت پذیرد شانِ حق خویش را حق داند از بطلانِ حق
مُدعی گرمایہ دارِ قوت است دعویٰ او بے نیاز از حُجت است

مشہور عالمِ دین مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے اقبال کے سارے کارناموں کی پشت پر قرآن کا جلوۂ نُور خوب پہچانا ہے۔ خطبات کے حوالے سے جہاں وہ ایک اہم اقبال شناس کا تعارف ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں کہ سید نذیر نیازی مرحوم علامہ کے بڑے معتمد تھے،

انہوں نے علامہ کے حکم سے اور اُن کی نگرانی میں ہی خطبات کا اُردو ترجمہ مع تشریحات و تعلیقات کے بڑی خوبی اور تحقیق و تدقیق سے کیا ہے۔ نیازی کو فلسفے کا بڑا فاضل اُستاد مانتے ہوئے مولانا اکبر آبادی موصوف کے اِس بیان کی تائید کرتے ہیں کہ علامہ کی شاعری کی طرح ان کی نثر میں موجزن اس فِکر کا حقیقی سرچشمہ بھی قرآنِ مجید ہی ہے اس لیے قرآن مجید سے ہی ہمیں ان سب مسائل و مشکلات میں جو اس تشریح و توضیح میں پیدا ہوں۔ رجوع کرنا پڑے گا۔

قارئینِ کرام! اِس پیش لفظ میں اپنے چند فاضل پیشروؤں کے فِکر انگیز اقتباسوں پر مشتمل یہ گوشوارہ میں نے کلامِ اقبال کے عظیم ترین سرچشمے سے متعلق صرف ایک تمہید کے طور پر ترتیب دیا ہے نُورِ قرآن سے پُورا فیض نہ پانے والے اقبال پسندوں کی کثیر تعداد کو نظر میں رکھ کر ہی اس کتاب کے آغاز میں دو ایسے مفصل مضمون شامل کر لیے گئے ہیں جن میں قرآنِ حکیم کے فیضِ عام کا سراغ کئی دینی عالموں کے حوالے سے بہم پہنچایا گیا ہے۔ اُن دو مضمونوں کے بعد شامل کر لیے گئے مضامین میں اقبال کے افکار اور فن سے متعلق خالصتاً مشرق سے تعلق رکھنے والی چند ایسی شخصیات کا اور اُن کی دین کا مختصر تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے جن سے اِکتسابِ فیض کرنے کا علامہ نے خود بھی برملا یا بالکنایہ اعتراف کر لیا ہے۔ دوسرے حصے کے سات مقالوں میں علامہ اقبال کے فنِ شعر پر کی گئی عمدہ بحثوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یوں اس کتاب میں اقبال کے مغربی سرچشموں سے دانستہ طور پر صرفِ نظر کیا گیا ہے تاکہ یہ زیادہ ضخامت پذیر نہ ہونے پائے۔ بہر حال اِس مجموعے میں شامل چند مقالوں کا تعلق اُس زمانے سے ہے جب میں مرحوم پروفیسر آل احمد سرور کی رفاقت میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے اساسی تدریسی عملے میں شامل تھا اُس کے بعد میں نے دانشگاہِ کشمیر میں مذکورہ اِدارہ کی طرف سے منعقد ہونے والے سالانہ سیمناروں میں وہ بقیہ مقالات پیش کیے ہیں جو آج اس کتاب کی شکل میں آپ کے پاس پہنچ رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ اب تک شائع شُدہ میری مختلف کشمیری اور انگریزی کتابوں کی طرح اس مجموعۂ مقالات کی بھی پذیرائی کی جائے گی۔ انشاء اللہ اُلمُستعان

مرغوبؔ

◆◆◆

قرآنِ حکیم۔ اقبال کے عقائد وافکار کا عظیم ترین سرچشمہ

اَعُوْذُ بِا للّٰہِ من الشَّیطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَ لَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ ھٰذَا لْقُرانِ مِنْ کُلِّ مَثَلٍ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُونَ قُرْانًا عَرَبِیًا غَیْرَ ذِی عِوَجٍ لَعَلَّھُمْ یَتَّقُونَ۔ (الزمر :۲۸)

قرآن پاک نے اپنا تعارف کئی حسین اور فکر انگیز پیرایوں میں پیش کیا ہے۔ اوپر دی گئیں دو روشن آیتوں میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس قرآن میں لوگوں کی رہنمائی کے لئے حقیقی فلاح اور سعادت تک پہنچانے والی ساری مُفید باتیں بیان کی گئی ہیں۔ گویا اپنی نوعیت کی اس واحد اور جامع کتاب میں خالقِ کائنات نے حیات وممات سے متعلق ہر نوع کے حقائق کو خاص ڈھنگ سے پیش کر دیا ہے۔ اِن حقائق کو اِس اُمید پر پیش کیا گیا ہے کہ عقل وتمیز اور زبان وبیان کی کئی امتیازی خصوصیات سے نوازے گئے انسان اس قرآن کے تئیں ذکر وفکر اور علم وعمل کے تقاضوں کو پورا کریں گے اور یوں اپنے آپ کو خلیفۃ اللہ کہلانے کے اہل ثابت کریں گے۔ اور پھر یہ قرآنِ حکیم غیر مبہم اور واضح عربی زبان میں اس امید پر نازل کیا گیا ہے کہ لوگ اس کے مفاہیم آسانی سے سمجھ سکیں گے اور ان مفاہیم پر صدقِ دلی سے عمل پیرا ہو کر وہ اپنے فرائض نبھانے اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے کے لئے خوفِ خدا اور پرہیز گاری کا طریقہ اپنائیں گے۔

بحیثیتِ کلام اللہ اپنے بارے میں دیئے گئے قرآن کے ایسے روشن بیانات پر غور کیجئے اور اس بات کا اندازہ لگانے کی کوشش کیجئے کہ آپ کا دل سچائیوں کا اثر قبول

کرنے سے کس قدر محروم ہے اور کس قدر محروم نہیں ہے۔ محروم نہ ہونے کا ثبوت آپ کو اس بات سے مل جائے گا کہ آپ ایسے ہر بیان میں چھپی ہوئی آسمانی اور لاہوتی آواز کی زندہ روح کو محسوس کرنے لگیں گے بلکہ قرآن آپ کو اللہ کے ساتھ شرفِ ہمکلامی کی خاص کیفیت سے نوازنا شروع کر دے گا۔ اور علامہ اقبال کے والد کے الفاظ میں قرآن پاک آپ کو اپنے اوپر نازل ہوتا دکھائی دینے لگے گا۔ جب نورِ صداقت کی اثر پذیری سے محروم نہ ہونے کا یہ ثبوت آپ کو اپنے ہی ضمیر سے ملنے لگے گا تو قرآن کا یہ اعلان آپ کو حرف بحرف سچ دکھائی دے گا کہ ''ہم نے قرآن کا سمجھنا تمہارے لئے آسان بنا دیا ہے''

گویا اپنے ضمیر کو بیدار کرنے اور قرآنی اِظہار و بیان سمجھنے کے لئے مطلوبہ علمی ریاضت کرنے کی بدولت آپ اپنے ہی دل کو اس بات کی گواہی دیتے پائیں گے کہ: یہ واقعی کلامِ الٰہی ہے جو پوری دنیائے انسانیت کے سامنے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ قدیم کا ایک قائم بالذات نور ہونے کا منہ بولتا ثبوت بھی ہے اور اس کا ایک آئینہ بھی۔ قائم بالذات نور ہونے کی حیثیت سے کلام اللہ مولانا رومی کے الفاظ میں کہتا ہے کہ میں قرآن خدائی سورج کی تم پر پڑنے والی وہ دھوپ ہوں، جو سورج سے کبھی جدا نہیں ہوتی۔

نورِ خورشیدم ،فتادہ بر شما لیک از خورشید ناگشتہ جُدا

پھر ذاتِ قدیم کے آئینہ کی حیثیت سے قرآنِ پاک ایسا آئینہ ہے جس میں ذاتِ قدیم چشمِ بینا کیلئے بہمہ صفات جلوہ گر ہے۔ قرآنِ مجید آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے کاملاً عمل میں لایا گیا مکمل ضابطۂ حیات بھی ہے اور آنحضور ﷺ کی سیرتِ طیبہ کی مکمل نشاندہی کرنے والی بہترین رحمانی نعت بھی ہے کیونکہ اسی بابرکت کتاب کے ذریعے اللہ پاک نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محض ایک بشر قرار دینے کے باوجود رشکِ ملائیکہ بتا دیا ہے اور اہلِ عقل کے لئے آپکی لاثانی اور لافانی شخصیت کا سمجھنا

آسان بنا دیا ہے یہ کہہ کر کہ لقد انزلنا الیکم کتٰباً فیه ذکر کم افلاتعقلون (الانبیاء) ایسی ہی آیاتِ بینات کی بنیاد پر حضرت عائشہ صدیقہؓ نے قرآن مجید کو آنحضورؐ کی سیرت کا بہترین اور مکمل نمونہ قرار دیا ہے۔ ''کانَ خُلُقَهٗ قراٰن''

قرآنِ کریم رموزِ حیات اور اسرارِ کائنات کا ایک سرمدی اور ابدی خزانہ ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام آسمانوں اور زمینوں کی گرانقدر چیزوں میں سب سے زیادہ محبوب قرآن مجید ہے۔ (سنن دارمی) دنیا کی تاریخ اقوام اور انسانی تہذیب کی داستانِ باستان قرآن جیسا کوئی دوسرا کیمیائی نسخہ اور آسمانی تحفہ پیش کرنے سے عاری ہے۔ اپنے پیارے نبیؐ کے واسطے سے پُوری انسانیت کو فیضیاب کرنے کے لئے بخشی گئی اللہ کی یہ عظیم نعمت ایک ایسی زندگی بخش، بصیرت افروز اور تقدیر ساز کتاب ہے، جو اس سے پیشتر نازل کئے گئے تمام آسمانی صحیفوں کی تصدیق کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ سے شروع کئے گئے دینِ حق اور صحیفوں کے تسلسل کو اسی طرح سے اس خاتم الوحی قرآن پر تکمیل پذیر کرایا ہے، جس طرح سے اس نے اپنے رسولوں کے سلسلے کو خاتم الانبیاً حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تکمیل پذیر کرایا ہے ان دونوں کے سلسلے میں تکمیل کا ربانی اعلان کتنا عالیشان ہے۔ الیوم اکملتُ لکُم دینکُم واتممتُ علیکُم نعمتی۔

۶۶۶۶ر آیتوں، ۱۱۴ر سورتوں اور ۳۰ر پاروں پر مشتمل قرآن کا کچھ (۹۰ سورتوں پر مشتمل) حصہ مکہ معظمہ میں اور کچھ (۲۴ر سورتوں پر مشتمل) حصہ مدینہ پاک میں آنحضور ﷺ پر جبریل امینؑ کے ذریعے پورے ۲۳ر سال تک درپیش معاملات کی مناسبت سے نازل ہوتا رہا ہے۔ نازل ہونے والی پہلی آیت ہے اِقراء باسم ربّکَ الذی خلق اس آیت کا پہلا لفظ ''اِقــراء'' قران کی وجہ تسمیہ کی جانب ایک دلکش

اشاریہ کا حامل ہے۔ پڑھیے اور پڑھیے کا مفہوم رکھنے والا ''اِقرا'' لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کلام اللہ کی حیثیت سے قرآن خاص ڈھنگ سے بار بار پڑھا جانا چاہیئے۔ قرآن کے خاص ڈھنگ سے پڑھے جانے میں آدابِ قرائت کے علاوہ اس کو انتہائی غور وخوض سے پڑھنے کا تقاضا بھی شامل ہے۔ کیونکہ قرآن کو غور وفکر سے پڑھنے کی بدولت ہی پڑھنے والے کے دماغ کی جاروب کشی اور دل کی صیقل ہو جاتی ہے اور ایسا کرنے کی بدولت ہی اسکی چشمِ دل بصیرت سے ہمکنار ہو جاتی ہے اور وہ اپنے آپ کو عملاً اندھیرے سے نکل کر اُجالے میں پہنچتا محسوس کرتا ہے کیونکہ اُس کو اپنے سامنے دین ودنیا کی فلاح وکامیابی کے سارے دروازے یکے بعد دیگرے کھلتے محسوس ہوتے ہیں اور ایسا محسوس ہونا ایک فطری بات ہے کیونکہ اس طرح کی سعادت حاصل ہو جانیکی ضمانت خود اللہ نے ان الفاظ میں دے رکھی ہے۔ الٓرٰ ؕ کِتٰبٌ اَنزلنٰہ الیکَ لِتخرِجَ النّاس مِن الظلمتِ اِلی النورِ ؕ بِاذنِ ربّھم اِلٰی صِراط العزیزِ الحمید۔

''میرے پیارے رسولؐ! یہ کتاب میں نے تمہاری طرف اسلیئے نازل کی ہے تا کہ تم لوگوں کو اسکی بدولت اندھیرے سے اجالے کی طرف نکالنے کا ایک حتمی سلسلہ جاری کر سکو۔ تمہیں ان تمام لوگوں کے پروردگار کی طرف سے اس بات کا پروانۂ اجازت دیا جاتا ہے کہ انہیں اُس زبردست خوبیوں والے معبود کی طرف لے جانے والے خاص راستے کا سراغ بتادو'' .... (سورۂ ابراھیم)

سیدھے اور خاص راستے کا سراغ بتانے کے چند بلیغ اشارے سورۂ نحل میں بھی بہم پہنچائے گئے ہیں مثلاً یہ کہہ کر فاِذاقرِ ات القراٰن فاستعذ با للّٰہ مِن الشّیطٰن الرجیم

''سو جب تم قرآن پڑھنا چاہو تو پہلے اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگو اس شیطان کے

شر سے جس کو مردُود قرار دیا گیا ہے''۔

اس بلیغ اشارے کے بعد اسی سورہ نحل میں قرآن کے نازل ہونے پر احمقانہ اور غیر ذمہ دارانہ باتیں کرنے والوں کو مفصل جواب دینے کا انداز بھی رسول اللہ کو سکھایا جاتا ہے یہ کہہ کر کہ ''آپ کہہ دیجئے اس قرآن کو اللہ کے ہاں سے میرے پاس ایک پاک فرشتے (روح القدس: جبریلِ امین) نے اُتارا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں بلکہ یہ تو اپنا ثبوت آپ ہے۔ مگر اُن کے لئے جو ایماندار ہیں۔ اور یہ قرآن تو اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے والوں کے لئے سراپا ہدایت اور خوشخبری ہے۔ یا رسول اللہؐ مجھ کو تو قرآن پر باتیں بنانیوالوں کی ہر بیہودگی کا پُورا علم ہے۔ (یہ اچھی طرح جان لینے کے بعد کہ نہ تو آپ نے چالیس سال تک کچھ پڑھا لکھا ہے اور نہ کوئی شعر کہا ہے) اب یہ کہتے ہیں کہ اس کو یہ قرآن کوئی آدمی آکر سکھاتا ہے اور یہ بھی گڑھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ شاید اس آدمی کی زبان عجمی ہے۔ اور ادھر سے یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ اس قرآن کی زبان کتنی معیاری اور فصیح و بلیغ عربی ہے۔ خیر جن لوگوں کو اللہ کی ان باتوں پر یقین نہیں آتا اللہ بھی ان کو ہدایت کا راستہ نہیں دکھاتا اور بے شک ایسے لوگوں کو ایک انتہائی دردناک عذاب سے دو چار ہونا ہے'' پھر مشفقانہ دردمندی سے سورۂ النساء میں اللہ پاک رسولِ محترم صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں مخاطب ہوا ہے کہ کیا یہ لوگ اس بات پر بھی غور نہیں کرتے کہ اگر یہ قرآن کسی اور کی طرف سے نازل کیا ہوا نسخہ ہوتا تو (پوری کائنات سے متعلق حقائق بیان کرنے والی) اس کی عبارت میں بہت سا اختلاف پایا جاتا۔ اللہ نے اس کے علاوہ اپنے رسولؐ سے یہ بھی کہدیا کہ ان سے بطورِ چیلنج کہہ دیجئے کہ وہ جا کر پُوری دنیا کے عالموں اور فاضلوں کو اکٹھا کریں اور قرآن کی ۱۱۴ روشن سورتوں جیسی دس ہی سورتیں پیش کر کے دکھائیں۔ قل فاتو بعشر سورٍ مثله مُفْتَرَيٰتٍ... (هود) ظاہر ہے کہ ان سے یہ نہیں ہوسکتا۔ اب آپ کہئے کہ ایک ہی سورت پیش کرو اگر تم سچے ہو۔ فاتوا

بسورۃٍ من مثلہ و ادعو اشھد آ کم (البقرہ)۔ پھر جہاں ُالرّحمٰن ہ۔ علم القران ہ۔ کہہ کر اس کی وضاحت کی گئی کہ آپؐ کو قرآن اپنے شفقت اور مہربانیوں والے معبود نے سکھایا ہے وہاں سورۃ الحاقہ کے دوٹوک الفاظ میں ''وماھو بقولِ شاعر''ہ۔ اور ولابقول کاھن ہ۔ کہہ کر یہ بات بھی پوری قطعیت سے کہی گئی ہے کہ یہ کسی آدمی مثلاً کسی شاعر یا کسی کاہن کا کلام نہیں ہے بلکہ یہ فقط پاک پروردگار کا بھیجا ہوا خاص انعام ہے۔ ''تنزیل من رب العالمین'' ساتھ ہی اس بات کی بھی وضاحت فرمادی گئی کہ ''اگر ہم اس قرآن کو عربی کے بجائے کسی اور عجمی زبان میں نازل کرتے تو (بیہودہ اعتراضات پر کمربستہ) یہ قرآن کے اولین مخاطب لوگ کہنا شروع کردیتے کہ اس میں بیان کی گئیں باتوں کو کھول کر کیوں بیان نہ کیا گیا ہے۔ یعنی ہم عربی بولنے والوں میں اس عجمی مسودے کو نازل کرنے کا جواز کیا ہے۔''

(حٰمٓ السجدہ) پھر ان اعتراض کرنے والوں کی بدبختی اور سیاہ دلی کی واضح نشاندہی کرتے ہوئے کہا گیا کہ اگر (اس قرآن میں مضمر ہزاروں معجزاتی اور کراماتی خصوصیتوں سے پردہ ہٹا کر) اس کو ایک ایسا قرآن بنا کر اُتارا جاتا جس کے ذریعے سے پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹائے جاتے اور جس کے ذریعے سے ''طے مکان'' یعنی مہینوں کا سفر لمحوں میں طے کیا جاتا جس کے ذریعے سے لوگوں کو مُردوں سے باتیں کرائی جاتیں یہ (بدباطن) لوگ تب بھی ایمان نہ لاتے۔ (الرعد) قرآن سے متعلق کافروں اور مشرکوں کی بیہودہ باتوں کو چند بدباطن لوگوں کی شکست خوردگی پر محمول کر کے اللہ پاک اپنے رسولؐ سے اب یوں مخاطب ہوتا ہے۔ ''قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یاتوا بمثل ھٰذا القراٰن لایاتون بمثلہ ولوکان بعضھم لبعضٍ ظھیراًہ ط۔ (بنی اسرائیل) یعنی یارسول اللہؐ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ لوگ دنیا کے سارے انسانوں اور جنوں میں پائے جانے والے عالموں اور عاقلوں کو جمع کر کے ایک

دوسرے سے تعاون کرائیں تب بھی وہ اس قرآن جیسی کوئی چیز تیار نہ کرسکیں گے جو اس کی طرح بشریت کی ساری بیماریوں کا علاج کرسکتی ہو۔ بہرحال ایسے بیانات پر غور کرنے سے یہ بات قرینِ قیاس بن جاتی ہے کہ قرآن کو عربی میں نازل کرنے میں دراصل یہ مشیت کارفرما رہی ہے کہ ایک انتہائی بگڑے ہوئے معاشرے تک اللہ کی آخری تنبیہہ اور وعید پہنچائی جائے اور اُسی میں سے بطورِ نمونہ ایک صحت مند معاشرے کو تشکیل دینے کا (بظاہر ناممکن دکھائی دینے والا) کام اولاً خود رسول اللہؐ کے ذریعے ہی انجام دلایا جائے:۔ وکذالک انزلنٰہ قراٰناً عربیا وصرفنا فیہ من الوعید لعلھم یتقون اویحدث لھم ذکراً ہ۔۔(طٰہٰ)۔ اور اللہ کو دراصل یہ بات بھی ملحوظ تھی کہ عالمی سطح پر لائے جانے والے انقلاب کا نقطۂ آغاز اللہ کے گھر اور پہلی عبادتگاہ والے اس مکہ معظمہ کو بنایا جائے جہاں دنیا میں لوگوں کا سب سے بڑا مذہبی مجمع لگتا ہے۔ اللہ کو یہ بھی ملحوظ خاطر تھا کہ مکہ کے آس پاس والے مدینہ منورہ میں ہی انسانوں کے صالح ترین معاشرتی، روحانی اور اخلاقی نظام کا پہلا مکمل نمونہ قائم کرایا جائے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ وکذالک اوحینا الیک قراٰناً عربیاً لِتُنذر اُم القریٰ ومن حولھا وتنذر یوم الجمع لاریب فیہ ہ۔۔۔۔۔(الشوریٰ)۔

چشمِ دنیا کے سامنے انسانیت کا مثالی اور صالح ترین معاشرتی نظام (انصار اور مہاجرین پر مشتمل اپنے اصحابِ پاک کو ایمان وایثار کی تربیت کرنے والے) رسول اللہؐ نے نزولِ قرآن کی بدولت اور اس پر عمل پیرا ہونے کی بدولت ہی پیش کیا ہے۔ لہٰذا یہ باتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں کہ قرآن کی نعمتِ عظمیٰ جس انسانِ کامل پر اتاری گئی وہ اچھے کام کرنے پر جنت ملنے کی خوشخبری سنانے والا بھی ہو اور بُرے کام کرنے پر جہنم کا ڈر سُنانے والا بھی ہو۔ انا ارسلنٰک بالحق بشیراً و نذیرا (البقرہ)۔ اسی طرح سے یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ عالمِ انسانیت کو عطا کی جانے

والی یہ عظیم نعمت جس رات میں زمین پر نازل ہونا شروع ہوگئی اس رات کا درجہ (خالقِ لیل ونہار) خدانے ایک ہزار مہینوں سے زیادہ بابرکت قرار دے کر متعین کیا ہے: انا اَنزلنٰہُ فی لَیلۃ القدر ہ وما ادرٰک مالیلۃُ القدر ہ۔لیلۃ القدر خیراً من الف شھرہ ط چونکہ لیلۃ القدر (شبِ قدر) رمضان کے مہینے میں آتی ہے اس لئے مزید توضیح کے طور پر دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ قرآن کا نزول رمضان کے بابرکت مہینے میں شروع کیا گیا ہے:شھر رمضان الذی اُنزل فیہِ القرآن ہ۔

اب یہاں پر ورطۂ حیرت میں ڈالنے والا یہ اہم سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ اگرایک رات کی قدرومنزلت صرف اسلئے تیس ہزار گنا سے زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ اس کے دوران قرآن کریم کا مبارک نزول شروع ہو جاتا ہے تو اُس اُمت کواِسی مُناسبت سے ہزاروں گُنا درجہ بڑھ کر خیرالامت بن جانے کی سعادت حاصل ہو جانے کے بعد انتہائی تنزل اورپستی سے کیوں دوچار ہونا پڑا ہے:جس کے پاس یہ آسمانی ، لافانی اورعرفانی تحفہ آج بھی مکمل صورت میں موجود ہےاور جس کومکمل طور پر محفوظ رکھنے کا وعدہ اوراہتمام خودعلیم وحکیم خدانے یہ کہہ کرفرمارکھا ہے کہ:انا نَحنُ نَزلنا الذکرَ وانا لہٗ لَحٰفِظُون (الحِجر:۹) ۔اس اہم سوال کا جواب قرآن میں بھی موجود ہے اورنورِ قرآن کے بہت سے پروانوں اورشیدائیوں نے بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق اس کاجواب دینے کی کوشش کی ہے۔

پہلے ہم قرآن میں موجود تین طرح کے اشاروں سے برآمد ہونے والے جواب پرتوجہ مبذول کرتے ہیں اس ضمن میں پہلامعنی خیزاشارہ سورہ احزاب کی آیت اِناعرضنا الا مانۃعلی السمٰوات والارض (الخ)اورسورہ الحشرکی آیت لو انزلنا ھذالقراٰن علیٰ جبلِ (الخ) میں موجود ہے۔ان آیتوں میں ہردور کے لئے اس باتکی نشاندہی کردی گئی ہے کہ انسان بحیثیتِ مجموعی غفلت اور جہالت کامرتکب

ہوکر آسمانی وحی کی مطلوبہ قدر دانی سے قاصر رہتا ہے اور مادی ترجیحات کو اپنا کر وہ دراصل اپنی ہمہ گیر ترقی میں خود حائل ہوجاتا ہے اور یوں ظلوماً جہولا ہونے کا عملی ثبوت بہم پہنچاتا رہتا ہے۔ انسان کو غفلت اور جہالت میں غرق کرنے والی بنیادی وجہ اس کے دل میں خوفِ خدا کی کمی ہے۔ کیونکہ خوفِ خدا کی کمی ہی انسانی دل کو زَر پرستی اور مادیات کی طرف ضرورت سے زیادہ میلان بڑھاتی ہے اور یہ میلان بڑھ جانے کے نتیجے میں نظر کی دُنیا ناپاک اور دل کی دُنیا تاریک ہوجاتی ہے پھر ناپاکی و تاریکی بصیرت سے محروم کرنے کا سبب بنتی ہے۔ چنانچہ بصیرت سے محروم ایسے کسی معاشرہ یا انسان کے سامنے روحِ قرآن کو جلوہ گر ہونا ہرگز گوارا نہیں ہوتا۔ حکیم سنائی نے اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے روحِ قرآن کو ''عروسِ حضرتِ قرآن'' یعنی روحانی دلہن کہہ کر یاد کیا ہے۔ موصوف نے روحِ قرآن کے جلوۂ تقدیر ساز سے فیضیاب ہونے کے لئے کعبۂ دل کا تمام باطل بُتوں سے اور مادہ پرستانہ آلائشوں سے پاک ہونا لازمی قرار دیا ہے۔ چنانچہ کہا ہے ؎

عروسِ حضرتِ قرآن نقاب آنگہہ براندازد
کہ دارالملکِ ایمان را مُجرد بیند از غوغا

کلمہ خوان شاعروں کیلئے اپنے اپنے ایمان کا دارالخلافہ (دِل) حرص و ہوس کے غوغا سے پاک ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے چنانچہ ان کیلئے پاک باطنی کے تقاضا کو سورہ الشعراء کے آخری رکوع میں واضح تر بنایا گیا ہے۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو بے حیائی اور گمراہی کی باتیں پھیلانے والے اور ہر وادی میں آوارہ پھرنے والے شاعروں سے الگ رکھ کر اپنی الگ شناخت قائم کرسکیں جب ہی تو جہلا کے ہاں واہ واہ اور پذیرائی حاصل کرنے والے شعراء کی واضح نشاندہی قرآن میں یوں فرمائی گئی ہے۔ والشعراء یتبعھم الغاؤن ہ۔ الم تر انھم فی کل وادٍ یھیمون ہ وانھم یقولون

مالایفعلون ہ الا لذین آمنو وعملو الصٰلحٰت وذکرو اللہ کثیراً وانتصرو من بعد ماظللمو ۔ط وسیعلم الذین ظلمو آ ائَ منقلبٍ ینقلبون ہ۔ چھ آیتوں پر مشتمل اس قرآنی اقتباس کے نصف اول میں قابلِ نفرین اور مذموم شاعروں کی نشاندہی یہ بتا کر کی گئی ہے کہ وہ ایسے شاعر ہیں جنکی باتوں پر گمراہ لوگ نہ صرف سر دُھنتے ہیں بلکہ بے حیائی اور نفسانی بگاڑ پھیلانے والی انکی باتوں پر وہ عمل بھی کرتے ہیں۔ اے پیارے نبیؐ کیا آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ اس زُمرے میں شامل (بے ضمیر) شاعر ہر میدان میں سرگردان پھرتے ہیں اور یہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر کبھی عمل نہیں کرتے۔ اس قبیل کے شاعروں کے برعکس اُن باضمیر لوگوں کی بات ہی کچھ اور ہے جو سچے دل سے ایمان لا چکے ہیں اور نیک کام کرتے ہیں جو اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں اور جو ظلم سہہ کر بھی ظلم کا توڑ کرتے رہتے ہیں۔ اب ظلم کرنیوالے خود اندازہ کرلیں گے اور جان جائیں گے کہ انہیں کس کروٹ الٹنا ہوگا۔ جو ہرِ شاعری اور تخلیقی صلاحیت کو اللہ کی امانت جاننے والے شعراء کے لئے اِس اقتباس کے نصف دوئم میں نیکیوں کی تحریک دینے والی شاعری کے مطلوبہ اہداف کا تعین بھی بڑے بلیغ انداز میں کیا گیا ہے۔ ہر چند زمرۂ شعراء میں مذموم قسم کے لوگوں کی موجودگی کا امکان کلامُ اللہ اور احادیثِ رسول اللہ کو ایسے کسی الزام سے بھی بری کر دیتا ہے، جو اس کو شاعری میں شامل کرنے کی جسارت کی جائے۔ چنانچہ رسول اللہؐ کو ساحر یا شاعر قرار دینے والے کج نظروں کو خود اللہ نے یہ جواب دیا وماعلمنٰہ الشعر وما ینبغی لہ۔ یعنی (دوسرے تمام پیغمبروں کی طرح) ہم نے اپنے آخری نبی کو بھی شاعری نہیں سکھائی ہے کیونکہ شاعر بن جانا ان جیسے اولوالعزم پیغمبروں کے شایانِ شان ہرگز نہیں تھا۔ گویا کلامِ اللہ اور کلامِ نبیؐ کی عرفانی عظمت اور تاثیر کہیں زیادہ برتر اور اعلیٰ ہے۔ چنانچہ اسی عرش آشنا نبویؐ نگاہ کو بے حیائی پھیلانے والے امراء القیس نامی دورِ جہالت کے عرب

شاعر کے فن اور فکر کا اصلی روپ نظر آیا ہے اور جب ہی تو ایک زمرہ کے شاعروں کا سردار قرار دینے کے باوجود اس کے جہنمی ہونے کا انکشاف بھی کیا گیا ہے۔ اور یوں نہ صرف اس مقولے کی توثیق فرمائی ہے کہ Even the Devil must be given his due بلکہ حق نوائی پر مبنی شاعری اور حق گوئی والے بیان میں تاثیر کی خاص قوت ہونے کا اِنکشاف بھی ایسے روشن الفاظ میں کیا گیا ہے۔ انَّ من الشعر لحکمة وانَّ من البیان لسحراً۔

حکیم سنائی کے عقیدت مند مولانا رومؔی نے مادی میلانات اور ترجیحات میں غرق ہونے کا سبب انسانی دل کی اُس محرومی کو قرار دیا ہے جو اُس کو خدا کے نہ پہچاننے کی وجہ سے حصے میں آتی ہے ورنہ اگر دل کو خدا کی پہچان یعنی معرفت حاصل ہو جائے تو حرصِ مال وزر اس کو ہرگز گرفتارِ بلا نہ کرا سکے گا ؎

آنکہ بینداو مُسبب راعیان
کے نہد دل بر سبب ہایِ جہان

مولانا رومؔی کا ارادتمند شاعر علامہ اقبال بھی قرآن کے ذریعے نشاندہی میں لائی گئی سچائیوں اور حقائق کو (خاص طور پر حوادثِ زمانی کو) پہچاننے کیلئے دل اور نظر کی پاکی کو لازمی قرار دیتا ہے ؎

زمانہ اپنے حوادث کو چھُپا نہیں سکتا
ترا حجاب ہے قلب ونظر کی ناپاکی

بہرحال جس طرح قرآن کے خارجی وجود کو چھُونے سے پہلے جسمانی طہارت کا تقاضا لایمسه الاالمطهرون ہ کہہ کر کیا گیا ہے اسی طرح سے قرآن کی روح تک رسائی پانے کیلئے: ان قرآن الفجر کان مشهوداً ہ کہہ کر سحر گاہی کی تلاوت میں آنسوؤں سے دل کا غسل کرتے رہنے کو خدائے قرآن کے روبرو

پہنچانے کا خاص وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔

نورِ قرآن سے فیضان پانے کا دوسرا معنی خیز اشارہ قرآن کی تمہیدی عبارت یعنی سورہ البقرہ کی ابتدائی آیات میں موجود ہے۔ ان آیتوں میں قرآن کی بدولت ہدایت پانے اور اندھیرے سے نکل کر اُجالے میں پہنچنے کی ہمہ گیر سعادت پانے کے لئے: الٓمٓ ہ سے اولٰئِک ھم المفلحون ہ۔تک پانچ اہم تقاضے پیش کئے گئے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ پانچ اہم شرطیں عائد کی گئی ہیں اور یہ پانچوں روحانی نوعیت کی ہیں۔ انکی روحانی نوعیت اور بنیادی اہمیت محسوس کرانے کیلئے پہلے اِن آیاتِ بیّنات کا مفہوم ذہن میں رکھئے:۔

"یہ کتاب (یعنی قرآن) ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ یہ کتاب خوفِ خدا رکھنے والوں کو (حتمی ہدایت کا) راستہ دکھانے والی ہے۔ خدا سے ڈرنے والے لوگ دراصل وہ ہیں جو بن دیکھے ہی (خدائے واحد، پیغمبر، مشیت، ملائکہ، تقدیر، محشر اور جنت وجہنم وغیرہ پر مشتمل) عالمِ غیب پر سچے دل سے ایمان لاتے ہیں اور (جو اللہ کے فضل وکرم سے حاصل ہونے والی) اپنی نیک کمائی میں سے (حاجتمندوں کی حاجت روائی اور صالح نظام کی تعمیر وتشکیل کے لئے بڑا دل رکھ کر) خرچ کرتے رہتے ہیں۔ اور قرآن کا نورِ ہدایت پانے کے مستحق وہ لوگ ہیں جو آپ پر نازل کی گئی کتاب اور آپ سے پہلے گزرے ہوئے پیغمبروں پر نازل کی گئیں کتابوں پر ایمان لاتے ہیں اور جو آخرت (یعنی ہر اچھے اور برے کام کی پرسش اور جزا وسزا کے لئے منعقد ہونے والے یومِ حساب) پر پکا یقین رکھتے ہیں۔ ان پانچ شرائط کی کسوٹی پر پُورا اترنے والے لوگ ہی قرآن سے فیضانِ ہدایت اور فلاحِ دارین پانے میں کامیاب ہوتے ہیں"

بات صاف ہے کہ ان پانچ شرائط پر پُورا اُترنے کی صدقِ دلانہ کوشش میں کمی واقع ہوتے ہی ہم قرآن خوان کہلانے کے باجود قرآن کے فیضان سے محروم ہوکر تنزل کے شکار ہوگئے۔ ہم قرآن نازل ہونے کی کیفیت اپنے اُوپر طاری کرنے سے محروم رہے تو یوں قرآن کے باطنی نور سے اپنے دیدہ و دل کو منوّر کرنے سے بھی محروم ہوگئے۔ ہم رسولِ اکرم ﷺ کی سُنت کو قرآن کی بہترین عملی تفسیر گردانے سے قاصر رہے اور یوں اپنے اعتقاد کی وہ عملی شہادت دینے سے بھی قاصر رہے جو ایمان اور عشقِ رسولؐ کا بنیادی تقاضا ہے جو شہادت گہِ الفت میں سُرخروئی بخشنے کا واحد ذریعہ ہے اور جس کی نشاندہی مولانا رومیؒ نے یوں کی ہے ؎

ایں نماز و روزہ و حج و جہاد ہم گواہی دادن است ازا عتقاد

اقبالؒ نے بھی روحِ قرآن سے مسلمانوں کے دور ہونے کا رونا کئی طرح سے رویا ہے مثلاً کبھی ہمیں قرآنی کردار والے اسلاف کی یاد دلا کر یہ کہا ہے۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہوکر

کبھی فکر انگیز ڈرامائیت سے کام لیکر ابلیس کو اپنے مشیروں کے ساتھ ہمکلام دکھا کر یہ کہتے ہوئے کہ اگر یہ قرآن سے دُور پڑی ہوئی زبُوں حال اُمت پھر سے عملاً حاملِ قرآن یا عاملِ قرآن بن جائے تو ہم ابلیسوں کی ابلیسیت زبردست خطرے میں پڑ جائے گی خصوصاً اگر یہ اُمت قرآنِ حکیم جیسے مکمل آئینِ حیات پر عمل پیرا ہوگئی تو دنیا میں ہمارا کوئی فریب چل نہ سکے گا علامہ اقبال نے جو الفاظ اس ضمن میں ابلیس کی زبان سے اُگلوائے ہیں وہ بڑی توجہ سے زیرِ غور لانے کے لائق ہیں مثلاً یہ اشعار بزبانِ ابلیس۔

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآن نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن ، مرد آزما ، مرد آفریں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف
مُنعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئین تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشا ہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں
ہے یہی بہتر اِلٰہیا ت میں الجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

اقبال نے طنز کے تیر چلا کر یوں بھی غافلانِ قرآن کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

بہ بندِ صوفی و مُلا اسیری　　حیات از حِکمتِ قرآن نگیری
بہ آیاتش تُرا کارے جُز این نیست　　کہ از یٰسینِ او آسان بمیری

اقبال مسلمانوں کو قرآن اور سنت پر کاربند دیکھنے سے پہلے ان میں وہ خود

شناسی دیکھنا چاہتا ہے جو انہیں قرآن جیسی عظیم امانت کی امانتداری سے عہدہ برآ ہونا سکھائے ورنہ وہ یہی کہتا ہے کہ۔

نماز و روزہ وقربانی و حج　　یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

بہر حال اپنے ہر حرف کے پڑھے جانے پر اللہ کی طرف سے دس نیکیوں کے برابر ثواب ملنے کی ضمانت بہم کرنے والی یہ روشن کتاب اپنے متعلقہ پیغمبرؐ کی اُمت سے خاص مومنانہ اور مجاہدانہ عمل کا تقاضا کرتی ہے۔ اس عمل کو جو تین خاص عنوان دئے جا سکتے ہیں انکی بات کرنے سے پیشتر اس تیسری معنی خیز بات کی نشاندہی کرنی مطلوب ہے جو روحِ قرآن سے دور ہونے کے سبب مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تنزل سے دوچار کرنے کا باعث بنی ہے۔ دراصل دعوتِ فکر و عمل دینے والی وہ بات ان بہت سی آیات میں موجود ہے جن میں قدیم بستیوں، امتوں اور تہذیبوں کے عبرتناک انجام کی طرف متوجہ کرنے کے علاوہ قرآنِ حکیم کو اپنا مکمل ضابطۂ حیات جان کر اس کے ہر حرف پر سنجیدہ غور کرنے اور اس کے ہر حکم پر عمل پیرا ہونے کی تاکید کی گئی ہے۔

ایسے مفاہیم کی حامل درجنوں آیات میں سے یہاں پر صرف دو آیتیں پیش کی جاتی ہیں۔ پہلے سنجیدہ غور و فکر کی دعوت دینے والی سورۂ ص کی یہ آیت پیش ہے: کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ وَ لِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ایک بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اسلئے نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل مند لوگ ان آیتوں سے نصیحت حاصل کریں۔ اب قرآنی ارشادات اور سنتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر مومنانہ اور مجاہدانہ عمل کرنے سے متعلق سورۂ طٰہٰ کی ایک آیت مُلاحظہ فرمائے۔ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص قرآن کے ذریعے بہم ہوگئی ہوئی ہدایت

اور رسول اکرمؐ کے ذریعے قائم ہوگئی ہوئی سنت پر عمل پیرا ہوگا وہ نہ تو دنیا میں گمراہ ہوگا اور نہ آخرت میں رُسوا ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ قرآن اللہ کا خاص نعمت خانہ اور خزانہ ہے، اس سے لو جس قدر لے سکو۔ میرے نزدیک اُس گھر سے زیادہ بے برکت کوئی مقام نہیں جس گھر میں خدا کی یہ کتاب نہ ہو۔ اور بے شک وہ دل جس میں کچھ بھی قرآن نہ ہوٗ ایک ایسا ویران گھر ہے جس میں کوئی رہنے والا نہیں (سنن دارمی) قرآنِ مجید تمام جسمانی اور روحانی امراض کی دوا ہے اللہ تعالیٰ خود اعلان فرماتا ہے: شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُومِنِیْنَ وَشِفَاءٌ لِمَافِی الصُّدُوْر۔۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ اگر کوئی سچے دل سے قرآن پڑھے تو پہاڑ بھی ہل جائے۔ علامہ سیوطی اتقان میں لکھتے ہیں کہ قرآنِ مجید طبِ روحانی ہے بشرطیکہ نیک لوگوں کی زبان سے ادا ہو۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے قرآن کی بدولت ہر مرض کی شفا حاصل ہوتی ہے۔ مگر چونکہ نیک لوگ کم ہیں اور ہر کس ؤ ناکس کی زبان میں اثر نہیں ہوتا اسلئے لوگوں نے طبِ جسمانی کی طرف رجوع کیا۔ اور اسی لئے جسمانی امراض میں روز افزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

قرآنی ارشادات پر غور و فکر کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے سلسلے میں مولانا رومؔی نے قرآن کو ایک انسانی شخصیت کی طرح داخلی اور خارجی حصوں میں باضابطہ طور تقسیم کیا ہے اور قرآن کی داخلی شخصیت تک رسائی پائے بغیر مولانا نے قرآن کی حتمی ہدایت میسر ہو جانے کو ناممکن بتایا ہے بلکہ مولانا نے ہی قرآن کی داخلی شخصیت کو سات بطنوں پر مشتمل ہونے کی بات کر کے اس کو روحانی ہفت خوان قرار دیا ہے۔ سُنئے اس ضمن میں مولانا کے یہ چند شعر

ظاہرِ قرآن چو شخصِ آدمی است   کہ نقوشش ظاہر و جانش خفی است

حرفِ قرآن را بدان کہ ظاہر است — زیرِ ظاہر باطنے بس قاہر است
زیرِ آن باطن یکے بطنِ دگر — خیرہ گردد اندرو فکرِ و نظر
زیرِ آن باطن یکے بطنِ سوم — کہ درو گردد خِردہا جُملہ گم
بطنِ چارم از پئے خود کس نہ دید — جُز خدائے بے نظیر و بے ندید
ہم چنین تا ہفت بطن اے ذوالکرم — می شمر تو زین حدیثِ محتشم
تو ز قرآن اے پسر ظاہر مبین — دیو آدم را نہ بیند جُز کہ طین

آخری شعر خاص توجہ چاہتا ہے جس میں ابلیس کے مرتد اور مردود ہو جانے کا واقعہ عبرت یاد دلا کر کہا گیا ہے کہ وہ آدم کے خارجی پہلو کو مٹی کا پتلا سمجھ کر اس کے داخلی جوہر کو نہ دیکھ سکا اور یوں آدم میں پوشیدہ رکھے گئے نورِ الٰہی کو دیکھنے سے محروم رہا۔ قرآن میں رکھے گئے نورِ ہدایت تک رسائی پانے کے لئے مولانا نے قاری اور قرآن کے درمیان حائل مختلف پردے ہٹانے کی بات یوں کی ہے

پاک کُن دو چشم را از موئے عیب — تا بہ بینی باغ و سروستانِ غیب
دفع کُن از مغز و از بینی زُکام — تا کہ ریحِ اللہ آید درمشام
پنبۂ وسواس بیرون کُن زگوش — تا بگوشت آید از گردون خروش

دنیائے غیب دیکھنے اور آوازِ غیب سننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو آدمی کلام اللہ سے شرفِ ہم کلامی پاتا ہے اور جہلا سے رومی کی طرح قرآن کو یوں پکارتے محسوس کرتا ہے کہ

تا قیامت مے زند قرآن ندا — اے گروہِ جہل راگشتہ فدا
مر مرا افسانہ مے پندا شتید — تخم طعن و کافری مے کاشتید
خود بدیدید آنکہ طعنہ مے زدید — کہ شما فانی وافسانہ بدید
من کلامِ حقم وقائیم بذات — قوتِ جانِ جان و یاقوتِ زکات

نورِ خورشیدم فِتادہ برشما لیک از خورشید ناگشتہ جدا
نِک منم ینبوعِ آن آبِ حیات تارہانم عاشقان رازین ممات

قرآنِ شریف اصحابِ رسولؐ کی راہ اپنانے والے شیدایانِ قرآن اور عاشقانِ رسولؐ کیلئے آبِ حیات کا منبع تب ثابت ہوا ہے جب انہوں نے مکمل اسلام کو اپنانے کے لئے مومنانہ عمل کے تین بنیادی عنوانوں کو سمجھا ہے اور انکے تقاضوں کو پورا کیا ہے۔

نمبر ایک تقاضا انفرادی کردار کی تعمیر کا تقاضا ہے مثلاً اس آیت میں : یا ایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطان انہ لکم عدو مبین...... (البقرہ)

''اے ایمان کا دعویٰ کرنے والو اسلام کے دائرے میں پوری طرح داخل ہو جاؤ اور شیطانی قدموں (یعنی اِزموں اور نظریوں) کی پیروی نہ کرو کیونکہ شیطان تمہارا کھُلا دشمن ہے''۔

اسلام کے دائرے میں پوری طرح داخل ہونے کا ثبوت قرآن کی اُس کسوٹی پر پُورا اترنے میں مضمر ہے جس کو مکمل اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہا گیا ہے اور جس کی نشاندہی یوں کی گئی ہے: قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (الخ)

اسلام کی محبت کا عملی ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل پیروی اور شرعی پابندی کی شکل میں چاہنے والا قرآنِ حکیم جہاں بندوں کو اپنے معبودِ حقیقی کی شانِ ربوبیت کا عرفان اُس کو رب العالمین قرار دیکر بخشتا ہے وہاں اللہ کے آخری رسول خاتم الانبیا فخرِ موجوداتؐ کی شانِ والا صفات کا تعارف بشیر اور نذیر کہنے کے علاوہ انہیں رحمۃ للعالمین قرار دیکر پیش کر رہا ہے۔ بلکہ اسی تناظر میں جب ہم قرآن کے ہر جُز کے اندر ذکرِ معبود کے ساتھ ذکرِ محبوب کا خاصا اہتمام دیکھتے ہیں تو مولائی شان سے کئے

گئے اللہ کے اس اعلان کا ہر پہلو دلنواز اور ذہن نشین ہو جاتا ہے کہ وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ ﷺ والے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وثنا کو واقعتاً انتہائی بلندی تک پہنچایا گیا ہے۔ نمبر دو تقاضا قرآن کو اللہ کی رسی جانکر مضبوطی سے تھامنے کا تقاضا یا آپس میں مضبوط اتحاد قائم کرنے کا تقاضا ہے تاہم تیسرا تقاضا مسلمانوں کو ہر معاشرے میں پہل کر کے صالحین کی ایک ایسی تنظیم یا جماعت تشکیل دینے کا تقاضا ہے جو وہاں پر نظامِ اخلاق، سماجی سدھار اور نظامِ عدل قائم کرنے میں رہنمایانہ رول ادا کر سکے اور جو کسی کو قرآن کا استحصال کرنے یا سورہ نحل کے الفاظ میں کسی کو قرآن کی بوٹیاں کرنے کی اجازت نہ دے۔ اس ضمن میں سورۂ النساء اور سورۂ بنی اسرائیل میں اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لئے فراہم کی گئیں بنیادی باتوں کا نفاذ بطورِ خاص زیرِ نظر رکھنا ہوگا۔ مثلاً حقوقِ زوجین، حقوقِ والدین، حقوقِ ہمسایگان اور حقوقِ محتاجان کا خیال رکھنے کے سلسلے میں یا حقوق اللہ اور حقوق العباد کی طرح ہی فرائضِ کاروبار اور فرائضِ معاملات کے سلسلے میں ورنہ جو شخص قرآن کے اوامر ونواہی کے تحت عائد ہونے والے حقوق اور فرائض کو نظر انداز کر کے قرآنی آیتوں کو اپنی غرض اور مرضی کے مطابق معنی پہناتا ہے تو وہ شخص بقولِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ خود جہنم میں بناتا ہے یہاں پر اُس حدیث رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حوالہ دینا کافی ہوگا جس کو امام غزالیؒ نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف احیاء العلوم کے بابِ تلاوت میں سب سے پہلے درج کیا ہے اور جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص قرآن شریف پڑھے اور یہ خیال کرے کہ دنیا میں قرآن سے بڑھ کر بھی کوئی نعمت ہے وہ شخص اللہ کی اس عظیم نعمت کی تحقیر وتوہین کا مرتکب ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک قیامت کے دن قرآن سے زیادہ بڑا کوئی شفیع نہیں ہوگا نہ کوئی نبی نہ فرشتہ اور نہ دوسرا کوئی۔ مجھے امام شافعی کی طرح اس نکتے کو ابھارنا بہت مرغوب ہے کہ دنیا میں ساری چمکدار شخصیتیں یعنی سورج چاند تاروں اور

انبیاء علیہم السلام سمیت سب مخلوق ہیں البتہ کلام اللہ ہونے کے ناطے فقط ایک قرآن حکیم ہے جو کائنات میں غیر مخلوق ہے اور براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس سے وابستہ ہے۔ اسی ذاتِ اقدس کے حوالے سے یہاں پر ہم رسولِ محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کا وہ جمالی پہلو چشمِ دل کے سامنے لانے کی کوشش کرینگے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخاطب کر کے لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ جیسی قدسی احادیث اور وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّارَحْمَتہ لِلْعَالَمِیْن ... جیسے نورانی ارشادات میں بکمالِ فصاحت ابھارا اور نکھارا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان گرامی ارشادات میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی اس کائنات کی تخلیق کا باعث اور آپکو ہی تمام عالمین کیلئے رحمت قرار دیا گیا ہے کیونکہ آپ ہی خاتم النبین ہیں اور آپؐ سے پیشتر مبعوث کئے گئے ہر پیغمبر کو کسی خاص قوم تک پیغامِ حق پہنچانے کی ذمہ داری تفویض ہوتی تھی لیکن آپؐ کے مبعوث ہونے پر اب پیغام کا دائرہ عالمگیر بنا کر حدِ امکان تک بڑھا دیا گیا۔ اسلئے لازمی بات تھی کہ آپ پر نازل کئے گئے قرآن کی اپیل بھی آفاقی، حتمی اور لافانی ہو، مشیتِ ایزدی کے ازلی فیصلے کی آئینہ داری کرنے والی مختلف آیات پر غور کیجئے تو قرآنِ حکیم کی جامع الحیثیات عظمت مرحلہ وار ظاہر ہوتی دکھائی دے گی اور آپ صدقِ دلی سے تسلیم کرینگے کہ یہ کیمیائی نسخہ کلام اللہ کی حیثیت سے ایک ایسا قائم بالذات نور ہے جو عقل، عشق، ادراک اور وجدان کو بقدرِ ظرف نوازنے کیلئے تا ابد مائل بہ کرم ہے۔ یہی سرمدی تحفہ رسول اللہؐ کے مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت سے جن و انس کو حتمی راہِ ہدایت دکھانے کے لئے خود آپ کے دل اور زبان پر جاری ہونے والا ایسا نغمۂ عرفان ہے جس نے تلامذ الرحمٰن کہلائے جانے کے مستحق شاعروں کو ہر دور میں دل و نظر کی تسکین بخشی ہے تبھی وہ قرآن کے جلال کی پردہ داری اور جمال کی آئینہ داری سے متعلق مختلف عرفانی نکتے ابھارنے کی سعادت پاتے

رہے ہیں مثلاً مولانا رومی جہاں کلام اللہ کو آنحضورؐ کے اخلاقِ حسنہ اور سیرتِ کاملہ کا احاطہ کرنے والا گنجینۂ اسرار قرار دیکر حضرت عائشہ کے ''کانُ خلقہٗ قرآن'' جیسے جامع بیان کی تائید کرتے ہیں وہاں وہ قرآن کے حکایتی پہلو کو اساطیر الاولین کہہ کر اپنی بد باطنی کا مظاہرہ کرنے والوں کو یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ

ہست قرآن حال ہائے انبیاء ماہیانِ بحرِ پاکِ کبریا

یعنی یہ قرآن حکیم اولوالعزم پیغمبروں کے پُرجد و جہد حالات کا ایک زندہ مرقع ہے۔ یہ تاریخ سازی اور انسانیت نوازی کے ایک ایسے پاکیزہ سمندر کی مانند ہے جس میں اللہ کی خوشنودی کیلئے بڑی مصیبتیں جھیلنے والے پیغمبروں کی شخصیتیں نورانی مچھلیوں کی طرح تیرتی دکھائی دیتی ہیں۔ مگر یہ صرف اس شخص کو دکھائی دے سکتی ہیں جو محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کے پیچھے نہ بھٹکے یا جو وحی کے نظامِ ترسیل کی تفہیم سے چشمِ دل کو بینا بنا سکنے سے محروم نہ رہے۔ یہی بات مولانا رومی نے یوں سمجھانے کی کوشش کی ہے

گرتو از قرآن حق نگر یختی باروانِ انبیاء آمیختی

پیغمبروں کو دیکھ سکنے یا ان کی پاک روحوں تک رسائی حاصل کر سکنے کی سعادت ان لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو قران پڑھتے ہوئے عقلی مباحث میں اُلجھ کر مغزِ قرآن یا روح قرآن کی پہچان سے قاصر نہ رہیں۔ یعنی جو باصطلاحِ مولوی استخوان ہائے متشابہات میں ہی مغزماری نہ کرتے پھریں موصوف نے اپنے حوالے سے یہ بات یوں بیان کی ہے

مغزِ قرآن از قرآن برداشتم استخوان بہرِ سگان بگذاشتم

مغزِ قرآن یا روحِ قرآن کو پہچاننا آسان کام نہیں یہ کلام اللہ کی تمازتِ جلال کو محسوس کرنے اور اس میں پروانہ وار بھسم ہونے کی نوبت پہنچنے کا نام ہے۔ اگرچہ لاکھوں سُورجوں سے تیز تر تمازت کی حامل کلام الٰہی کی جلالی دھوپ ظاہر ہوتے ہی پوری

دنیائے دل ونظر کو خاکستر بنا سکتی تھی۔لیکن ربّانی شفقت کے تحت بکمالِ تدبر اس دھوپ کو آئینہ درآئینہ زبانِ جبریلؑ اور زبانِ رسولؐ کے ذریعے جمالی چاندنی بنا کر نازل کیا گیا۔غالبؔ کے الفاظ میں:۔

آئینہ دار پرتوِ مہر است ماہتاب　　　آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ است

قرآن حکیم کی پُرجمال حکمت اور پُرجلال معرفت کا عرفان تخیلِ شعراء کے شہپر کو اس مقام پر بھی پہنچاتا ہے، جہاں وہ بھی مثلِ جبرئیلؑ پکار اٹھتا ہے کہ

اگر یک سر موے بر تر پرم　　　فروغِ تجلّی بسوزد پرم

اسی تجلّی کے ادراکِ پرسوز نے کشمیری زبان کے عظیم ترین قرآن شناس شاعر شیخ العالم علیہ رحمہ سے یہ استفہامیہ خود کلامی کروائی ہے

قرآن پران گوٚے نو سؤر　　　قرآن پران کو نو موؤکھ
قرآن پران دوٚد منصور　　　قرآن پران زِندٕہ رِتھ رؤ دُکھ
یا متھ پھوٚرِی اکہٕ ہوٚت ژوٚر　　　قرآن پران بے غم رؤ دُکھ
و دان اَڈجن پھوٚلگھ نوٚر　　　یمو پور قرآن شب و روز و وٚدُکھ

ان کشمیری اشعار کا مفہوم بھی پیش کیا جاتا ہے

''اے عظمتِ قرآن سے غافل شخص تو قرآن خوانوں میں شامل ہونے کا موقعہ پا کر اپنے نفسِ امارہ کو مارنے کی سعادت سے محروم کیوں ہے؟ قرآن کا نورانی اثر تمہاری خواہشاتِ نفس کو اب تک بھی کیوں راکھ نہ بنا سکا؟ یہ مقامِ افسوس ہے اور کیا ان خواہشات کا زندہ رہنا تیری شخصیت کے ایک زندہ لاش ہونیکا ثبوت نہیں۔ دیکھ زندہ شخصیت والے منصور کو، وہ تو قرآن پڑھتے ہی مانند شمع جل اٹھا۔

تو قرآن پڑھتے ہوئے اِس کو کلام اللہ جاننے کی حقیقت سے کیسے بے غم رہ سکا؟ تجھ میں یہی سیاہ دلی دیکھ کر ابلیس تجھ پر غالب آ گیا ہے۔

یاد کر اپنے عظیم المرتبت اسلاف کو انہوں نے قرآن خوانی کا حق اس پر غور کرتے ہوئے رات دن رو رو کر ادا کیا ہے۔ تب جا کر ان کے رگ و پے میں نور الٰہی کا ظہور ممکن ہو گیا ہے'' ظہور الٰہی سے فیضیاب ہو سکنے کیلئے انبیاء کی طرح وحی شناس نظر پیدا ہو جانی چاہئے۔ بقولِ مولانا رومیؒ ؎

آنکہ از حق یابد او وحی و خطاب
ہر چہ فرماید بود عینِ صواب

اسی طرح جہاں مرزا غالبؔ قرآن مجید کو خاتم الانبیاء کی واجبی ثنا اور مدح کیلئے وقف کیا گیا رحمانی دفتر تصور کر کے کہتے ہیں کہ

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزدان گذاشتم
کان ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

وہاں وہ اسی نعت میں کلام اللہ کو ایسا خورشید جلال تصور کرتے ہیں جو ہمارے آفتاب سے کروڑ گنا اور جلوۂ طور سے ہزار گنا زیادہ روشنی اور تمازت کا حامل ہونے کے ناطے کسی اور ڈھنگ سے ظاہر ہو جانے کی صورت میں عالم سوز واقع ہو سکتا تھا لیکن آنحضورؐ کے ماہتابِ تکلم کی پر جمال چاندنی بنا کر پیش ہونے کی بدولت یہ آسمان، زمین اور پہاڑوں کو لرزا دینے والا قرآن انسان کے لئے قابل برداشت بنا کر ہم تک کتابی شکل میں پہنچایا گیا ہے۔ غالبؔ کا حسین شعر پھر ایک بار سنئے ؎

آئینہ دارِ پرتوِ مہر است ماہتاب
آرے کلام حق بزبانِ محمدؐ است

مولانا رومیؒ اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

گرچہ قرآن از لبِ پیغمبر است
ہر کہ گوید حق نگفت آن کافر است

یعنی اگرچہ قرآن پاک اللہ کے آخری پیغمبر حضرت محمد عربیؐ کی زبان سے اور انکی زبان میں پیش ہوتا رہا ہے پھر بھی ایک نازک نکتہ سمجھنے میں ہی ایمان کی سلامتی ہے وہ یہ کہ اللہ پاک کا جلالی کلام رسول اللہؐ کی پر جمال زبان میں نازل ہو جانا خاص نوازش اور بندہ پروری کا عملی اقدام رہا ہے، جو شخص پھر بھی کہے کہ یہ اللہ کا کلام نہیں وہ یقیناً کافر

ہے۔

قرآنِ مجید میں عالمِ انسانیت کے درپیش مسائل کا حل کس حد تک موجود ہے؟ اِس ضمن میں آج سے چار دہائی پہلے تحریر کئے گئے اُس جواب کی حرف بحرف تائید کرنا ہی کافی ہوگا جو خلیفہ عبدالحکیم نے ایک ممتاز اقبال شناس کی حیثیت سے ان الفاظ میں دے رکھا ہے کہ ''انسانی زندگی کے مزید ارتقاء میں کوئی دور ایسا نہیں آسکتا جس میں قرآنی حقائق کا نیا انکشاف ترقیٔ حیات میں اُن کی رہبری نہ کر سکے۔ زندگی کی نو بہ نو صورتیں پیدا ہوتی جائیں گی لیکن قرآن کے اساسی حقائق کبھی دفترِ پارینہ نہ ہونگے''۔

اللہ جل جلالہٗ ہمیں جمال محمدیؐ اور نورِ قرآن سے فیضیاب ہونے کے آداب بخش کر سعادت دارین کا حقدار بنادے۔ آمین

میں اپنے اس مقالے کا اختتامیہ ان چودہ باتوں کو بنانا چاہوں گا جو بڑے ہی دلنشین پیرائے میں جناب محمد یوسف اصلاحی کی کتاب ''آدابِ زندگی'' میں ''تلاوتِ قرآن'' عنوان کے تحت نمبر وار درج ہیں۔ یوں:۔

۱ قرآن مجید کی تلاوت ذوق وشوق کے ساتھ دل لگا کر کیجئے اور یقین رکھئے کہ قرآن مجید سے شغف خدا سے شغف ہے۔ نبیؐ نے فرمایا میری امت کے لئے سب سے بہتر عبادت قرآن کی تلاوت ہے۔

۲ اکثر وبیشتر وقت تلاوت میں مشغول رہئے اور کبھی تلاوت سے نہ اُکتایئے۔ نبی ﷺ نے فرمایا خدا کا ارشاد ہے ''جو بندہ قرآن کی تلاوت میں اس قدر مشغول ہو کہ وہ مجھ سے دعا مانگنے کا موقع نہ پا سکے تو میں اس کو بغیر مانگے ہی مانگنے والوں سے زیادہ دوں گا۔ (ترمذی) اور نبی ﷺ نے فرمایا بندہ تلاوتِ قرآن ہی کے ذریعے خدا کا سب سے زیادہ قرب حاصل کرتا ہے (ترمذی) اور آپ نے تلاوت قرآن کی ترغیب دیتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ جس شخص نے قرآن پڑھا ہے اور وہ روزانہ

اس کی تلاوت کرتا رہتا ہے، وہ مُشک سے بھری ہوئی زنبیل ہے جس کی خوشبو چار سو مہک رہی ہے اور جس شخص نے قرآن پڑھا ہے لیکن وہ اس کی تلاوت نہیں کرتا تو اسکی مثال ایسی ہے جیسے مشک سے بھری ہوئی بوتل ہے اور اس کو ڈاٹ لگا کر بند کر دیا گیا ہے (ترمذی)

۳۔ قرآن مجید کی تلاوت محض ہدایت مانگنے کیلئے کیجئے۔ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے، اپنی خوش الحانی کا سکہ جمانے اور اپنی دینداری کی دھاک بٹھانے سے سختی کیساتھ پرہیز کیجئے۔ یہ انتہائی گھٹیا مقاصد ہیں۔ اور ان اغراض سے قرآن کی تلاوت کرنے والا قرآن کی ہدایت سے محروم رہتا ہے

۴۔ تلاوت سے پہلے طہارت اور نظافت کا پورا اہتمام کیجئے۔ بغیرِ وضو قرآن مجید چھونے سے پرہیز کیجئے اور پاک وصاف جگہ پر بیٹھ کر تلاوت کیجئے

۵۔ تلاوت کے وقت قبلہ رُخ دوزانو ہو کر بیٹھئے اور گردن جھکا کر انتہائی توجہ، یکسوئی، دل کی آمادگی اور سلیقے سے تلاوت کیجئے۔ خدائے قدوس کا ارشاد ہے "کتابٌ انزلنه الیک مُبارک لید بّروآ آیته ولیتذکر اولوالالباب

یہ کتاب جو ہم نے آپ کی طرف بھیجی برکت والی ہے تا کہ وہ اس میں غور وفکر کریں اور عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔

۶۔ تجوید وترسیل کا بھی جہاں تک ہو سکے لحاظ رکھئے۔ حروف ٹھیک ٹھیک ادا کیجئے اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھئے نبی ﷺ کا ارشاد ہے "اپنی آواز اور اپنے لہجے سے قرآن خوانی کو آراستہ کرو" (ابوداؤد) نبی ﷺ ایک ایک حرف واضح کرتے اور ایک ایک آیت کو الگ کر کے پڑھا کرتے تھے۔ اور نبی ﷺ کا ارشاد ہے۔

"قرآن پڑھنے والے سے قیامت کے دِن کہا جائیگا۔ جس ٹھہراؤ اور خوش الحانی کے ساتھ تم دنیا میں بنا سنوار کر قرآن پڑھا کرتے تھے۔ اسی طرح قرآن پڑھو

اور ہر آیت کے صلے میں ایک درجہ بلند ہوتے جاؤ۔ تمہارا ٹھکانا تمہاری تلاوت کی آخری آیت کے قریب ہے۔ (ترمذی)۔

۷۔ قرآن نہ زیادہ زور سے پڑھئے اور نہ بالکل ہی آہستہ بلکہ درمیانی آواز میں پڑھئے۔ خدا کی ہدایت ہے ''ولا تجهر بصلاتک ولا تخافت بها واتبع بين ذالک سبيلاً''۔ اور اپنی نماز میں نہ تو زیادہ زور سے پڑھئے اور نہ بالکل ہی دھیرے دھیرے بلکہ دونوں کے درمیان کا طریقہ اختیار کیجئے۔

۸۔ یوں تو جب بھی موقع ملے تلاوت کیجئے لیکن سحر کے وقت تہجد کی نماز میں بھی قرآن پڑھنے کی کوشش کیجئے۔ یہ تلاوتِ قرآن کی فضیلت کا سب سے اونچا درجہ ہے۔ اور مومن کی یہ تمنا ہونی چاہئے کہ وہ تلاوت کا اونچے سے اونچا مرتبہ حاصل کرے۔

۹۔ تین دن سے کم میں قرآن شریف ختم کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ نبیؐ نے فرمایا ہے ''جس نے تین دن سے کم عرصے میں قرآن پڑھا اس نے قطعاً قرآن کو نہ سمجھا''۔

۱۰۔ قرآن کی عظمت و وقعت کا احساس رکھئے اور جس طرح ظاہری طہارت اور پاکی کا لحاظ کیا ہے اسی طرح دل کو گندے خیالات، برے جذبات اور ناپاک مقاصد سے پاک کیجئے، جو دل گندے اور نجس خیالات اور جذبات سے آلودہ ہے اس میں نہ قرآن کی عظمت و وقعت بیٹھ سکتی ہے اور نہ وہ قرآن کے معارف و حقائق ہی کو سمجھ سکتا ہے۔ حضرت عکرمہؓ جب قرآن شریف کھولتے تو اکثر بے ہوش ہو جاتے اور فرماتے یہ میرے جلال اور عظمت والے پروردگار کا کلام ہے۔

۱۱۔ یہ سمجھ کر تلاوت کیجئے کہ روئے زمین پر انسان کو اگر ہدایت مل سکتی ہے تو صرف اسی کتاب سے اور اسی تصور کے ساتھ قرآنِ حکیم میں تفکر اور تدبر کیجئے اور اس کے

حقائق اور حکمتوں کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ فرفر تلاوت نہ کیجئے بلکہ سمجھ سمجھ کر پڑھنے کی عادت ڈالئے اور اس میں غور وفکر کرنے کی کوشش کیجئے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ ''القارعہ'' اور ''القدر'' جیسی چھوٹی چھوٹی سورتوں کو سوچ سمجھ کر پڑھنا اس سے زیادہ بہتر سمجھتا ہوں کہ البقرہ اور آل عمران جیسی بڑی سُورتیں فرفر پڑھ جاؤں او رکچھ نہ سمجھوں۔ نبیؐ ایک مرتبہ ساری رات اس ایک ہی آیت کو دھراتے رہے۔ ان تعذبھم فانھم عبادک وان تغفر لھم فانک انت العزیز الحکیم ہ۔

''اے خدا اگر تو انکو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو بخشدے تو تو انتہائی زبردست حکمت والا ہے''

۱۲۔ اس ارادے کے ساتھ تلاوت کیجئے کہ مجھے اس کے احکام کے مطابق اپنی زندگی بدلنا ہے اواسکی ہدایت کی روشنی میں اپنی زندگی بنانا ہے اور پھر جو ہدایات ملیں اُن کے مطابق اپنی زندگی ڈھالنے اور کوتاہیوں سے زندگی کو پاک کرنے کی مسلسل کوشش کیجئے۔ قرآن آئینے کی طرح آپ کا ہر ہر داغ اور ہر ہر دھبہ آپ کے سامنے نمایاں کر کے پیش کردے گا۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ آپ ان داغ دھبوں سے اپنی زندگی کو پاک کریں۔

۱۳۔ تلاوت کے دوران قرآن کی آیات سے اثر لینے کی بھی کوشش کیجئے جب رحمت، مغفرت اور جنت کی لازوال نعمتوں کے تذکرے پڑھیں تو خوشی اور مسرت سے جھوم اٹھئے اور جب خدا کے غیض وغضب اور عذابِ جہنم کی ہولناکیوں کا تذکرہ پڑھیں تو بدن کانپنے لگے۔ آنکھیں بے اختیار بہہ پڑیں اور دل توبہ وندامت کی کیفیت سے رونے لگے۔ جب مومنینِ صالحین کی کامرانیوں کا حال پڑھیں تو چہرہ دمکنے لگے اور جب قوموں کی تباہی کا حال پڑھیں تو غم سے نڈھال نظر آئیں۔ وعید اور ڈراونی آیات پڑھ کر کانپ اُٹھیں اور بشارت کی آیات پڑھ کر روح شکر کے جذبات

سے سرشار ہو جائے۔

۱۴۔ تلاوت کے بعد دعا کیجئے۔ حضرت عمرؓ کی بعدِ تلاوت والی ایک دعا کے الفاظ یہ ہیں:۔

اللّٰھم ارزقنی التفکرو التدبر بھایتلوہ لسانی من کتابک والفھم لہ والمعرفۃ بمعا نیۃ والنظر فی عجایبہ والعمل بذالک مابقیت انک علیٰ کل شیءِ قدیر ۃ۔

خدایا میری زبان تیری کتاب میں سے جو کچھ تلاوت کرے مجھے توفیق دے کہ میں اس میں غور و فکر کروں۔ خدایا مجھے اس کی سمجھ دے۔ مجھے اس کے مفاہیم و معانی کی معرفت بخش اور اس کے عجائبات کو پانے کی نظر عطا کر میں جب تک زندہ رہوں مجھے توفیق دے کہ میں اس پر عمل کرتا رہوں۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

☆☆☆

قرآنِ حکیم کو حقیقی آبِ حیات جاننے والا دیدہ ور.....علامہ اقبالؒ

کسی شاعر کے فکروفن اور عقیدہ ونظریہ کے بارے میں ایک غیر جانبدارانہ رائے قائم کرنے کی بہترین بُنیاد خود اس کے کلام سے فراہم ہو جانے والی داخلی شہادت بہم پہنچاتی ہے۔اس طرح کی شہادت ایک فلسفی شاعر کے عقیدہ اور نظریہ کو سمجھنے میں کچھ زیادہ ہی مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ چونکہ علامہ اقبال بھی دبستان ادب میں ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے ہی زیادہ معروف ہیں اسلئے ہم بھی ان کے درجنوں تبصرہ نگاروں اور تجزیہ کاروں کی بحثوں میں الجھنے کے بجائے کلامِ اقبال کی غواصی کو ہی ترجیح دیں گے اور یوں علامہ اقبال کے دل ودماغ پر پڑے ہوئے قرآن کے گہرے اثرات کی بلاواسطہ نشاندہی کرنے کی کوشش کریں گے۔

مقالے کی تمہید میں ہی یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے علامہ اقبال کو ان معنوں میں ایک فلسفی شاعر کہنے میں تامل ہے جن معنوں میں حکیم عمر خیام اور ابو العلا معرّی کو فلسفی شاعر کہا جاتا ہے کیونکہ حکیم الامت علامہ اقبال کے بالکل برعکس وہ دونوں مشہور فلسفی شاعر واقعاً حکیم العقل اور حکیم المنطق ہیں۔مثلاً خیام ایک طرح کے غلو سے کام لیکر اس ناپائیدار زندگی کو ہر صورت میں عیش کوشی سے گذارنے کا فلسفہ پیش کرتے ہیں اور معری دوسری طرح کے غلو سے کام لیکر زندگی کے ہر معاملے کو اتباعِ عقل سے ترتیب دینے کے علاوہ تارکِ لذات ہونے کا فلسفہ پیش کرتے ہیں۔ان دونوں

کے یہاں نظریۂ عمل اور جدوجہد کی نفی ملتی ہے۔ جبکہ اقبال کے یہاں ایسے کسی منفی رجحان کے برعکس غازی اور شہید پیدا کرنے والا نظریۂ ایمان ہی فلسفۂ خودی کی شکل میں نمودار ہو جاتا ہے۔ علامہ اسی پس منظر میں اپنے پیش رو حکیم سنائی شیخ عطار اور مولانا رومی کی طرح عقل کو جگہ جگہ ہدف تنقید بناتے ہیں۔ بلکہ منطق اور فلسفہ کے ہر منفی رجحان کا مضحکہ اڑانے میں وہ امام غزالی، شیخ سعدی اور مولانا جامی کی پروردہ مشترکہ ملی روایت کو اپنانے پر فخر بھی کرتے ہیں اور مرشد رومی کی اس آواز سے آواز بھی ملاتے ہیں کہ ؎

پائے اِستدلالیاں چوبین بود
پائے چوبیں سخت بے تمکین بود

جب ہی پورے اعتماد سے کہتے ہیں ؎

مرا از منطق آید بوئے خامی دلیلِ او دلیلِ ناتمامی
برویم بستہ در ہارا کُشاید دوبیت از پیرِ رومی یازِ جامی

یعنی خود فلسفہ کا طالبِ علم ہونے کے باوجود مجھے فلسفہ برائے فلسفہ میں ناقص عقل کی بو آتی ہے۔ اور اس کے برعکس فلسفہ برائے زندگی پیش کرنے والے رومی اور جامی جیسے قرآن شناس بزرگوں کے دو ہی شعروں سے سرشار ہو جاتا ہوں۔ اور مسائلِ زندگی کا حل حاصل کرتا ہوں۔

یہ بات دلچسپ ہے کہ علامہ اقبال نے قرآنِ مجید کو باضابطہ موضوعِ سخن بنا کر پہلا زوردار اور برملا اظہار اپنی سب سے زیادہ معرکتہ الآرا تصنیف اسرار و رموز کے آخری حصے میں دو الگ الگ عنوانوں کے تحت کیا ہے۔ پہلا عنوان ہے ''در معنی اینکہ نظامِ ملت غیر از آئین صورت نہ بندد و آئینِ ملتِ محمدیہ قرآن است'' لکھا گیا ہے کہ اب اس موضوع پر بحث ہوگی کہ آئین کے بغیر کسی قوم کے وجود کا تصور ممکن ہی نہیں ہے۔ اور یہ کہ حضرتِ محمدؐ کی قوم کے وجود کو قائم رکھنے کا ضامن آئین قرآنِ مجید کی شکل میں

موجود ہے۔ (میں نے آسانی کیلئے قوم لفظ یہاں استعمال کیا ہے ورنہ یہ ملت لفظ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے سے اسی طرح قاصِر ہے جس طرح مذہب لفظ دین لفظ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔) بہر حال علامہ اقبال نے اس عنوان کے تحت جو پتے کی باتیں بیان کردی ہیں اگر ان ہی پر تبصرہ کرنے بیٹھیں تو بلا مبالغہ ایک مقالہ تیار ہوسکتا ہے۔ اس لئے میں نے اس ۳۴ اشعار پر مشتمل مثنوی پارہ قسم کی نظم سے صرف چودہ اشعار کو چُنا ہے۔ پھر اس مقالے کو بیجا طوالت سے بچانے کیلئے ان چند اشعار کا صرف خلاصہ پیش کرنے کو کافی سمجھا گیا ہے تا کہ علامہ کی دوسری تصانیف میں قرآن پاک سے متعلق ابھارے گئے فکر انگیز اور غور طلب نکتوں کا ایک عکسِ جمیل بھی اس مجلسِ خاص کے سامنے لایا جاسکے پہلے مذکورہ عنوان کی نظم کے منتخبہ اشعار کا متن پیش ہے۔

ملّتے را رفت چوں آئین زدست
مثلِ خاک اجزائے او درہم شکست

ہستیٔ ملّی ز آئین است وبس
باطنِ دینِ نبیؐ این است وبس!

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چست
زیرِ گردوں سرِ تمکین تو چیست!

آن کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ اولایزال است وقدیم

نسخہ ی اسرارِ تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیر دثبات

حرفِ اوراریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

پختہ تر سودائے خام از زورِ او
ورفتد باسنگ جام از زورِ او

مے برد پابند و آزاد آورد
صید بندان را بفریاد آورد

نوعِ انسان راپیامِ آخرین
حاملِ او رحمۃٌ للعالمینؐ

ارج مے گیرد ازو نا ارجمند
بندہ را ازسجدہ سازد سربلند

از جہانبانی نوازد ہمازِ او!
مسندِ جم گشت پااندازِ او

اے گرفتارِ رسوم ایمانِ تو — شیوہ ہائے کافری زندانِ تو
گر تو می خواہی مسلمان زیستن — نیست ممکن جُز بہ قرآن زیستن
از تلاوت بر تو حق دارد کتاب — تو ازو کامے کہ مے خواہی بیاب

اب فارسی نہ جاننے والے احباب کیلئے ان اشعار کی تلخیص پیش ہے:

پہلے دو شعروں میں اس نظم کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے کہ جب کسی قوم سے اس کا آئین چھین لیا جاتا ہے تو اس قوم کا شیرازہ مٹی کے ذروں کی طرح بکھر جاتا ہے۔ مسلمانوں کی ملی زندگی کا راز فقط ان کے آئین پر منحصر ہے۔ خاص طور پر اس حقیقت کے پیش نظر کہ ان کیلئے فلاحِ دین و دنیا کی روح کا درجہ اسی آئین یعنی قرآن مجید کو حاصل ہے ..... اے اپنے آپ کو مسلمان قرار دینے والے شخص کیا تو نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ ایسا لافانی اور روشن آئین بخش کر دُنیا کی تمام قوموں میں تمہیں کون سا امتیاز بخشا گیا ہے؟ کیا تو نے اپنی برتری کے راز کو پانے کی کبھی زحمت بھی اٹھائی ہے؟ لے میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ تمہیں سرفراز کرنے والی چیز یہی زندہ کتاب ہے۔ جسکو قرآنِ حکیم کہا جاتا ہے۔ واقعاً اس میں بہم پہنچائی گئی ازلی حکمت کی روشنی ابدی اور لازوال ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق ہر طرح کے مسائل کا حل پیش کرنے والا یہ آخری آسمانی تحفہ اور سرمدی نغمہ فانی انسانوں کو بقائے دوام سے ہمکنار کرنیوالا آبِ حیات ہے۔ قرآن حکیم کا ہر حرف شکوک و شبہات سے بالاتر ہے اس کی زیر اور زبر تک کبھی تبدیل ہونیوالی نہیں اسکی آیاتِ بینات کا سورج تاویلوں اور غلط شرحوں کے بادل میں چُھپایا نہیں جاسکتا ہے۔ قرآنی عبارت کی روح پرور تمازت مٹی کے خامکار پُتلوں کو پُختہ کار بنانے کی بے پایاں صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے کیمیائی اور لاہوتی اثر سے ایک شیشہ بڑے پتھر سے ٹکر لینے کی جرأت حاصل کرتا ہے۔ جب قرآن کے زندگی بخش پیغام پر غلام پابندی سے عمل کرتے ہیں تو وہ آزادی سے ہمکنار

ہوکر رہتے ہیں ۔ قرآن کی آواز بند پنجروں میں پڑے ہوئے پرندوں کو ایسے معجزاتی ڈھنگ سے چھڑا کر پرواز بحال کر دیتی ہے۔ کہ ظالم صیاد کو اپنی روسیاہی پر روئے بغیر اور کوئی چارہ نہیں رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی قرآن شریف کی شکل میں بنی نوع انسان تک اپنا آخری پیغام پہنچایا ہے۔ اس خاتم الوحی قرآن کو پیش کرنے والا کوئی اور نہیں رہا ہے بلکہ بعثتِ رسالت سے بہت پہلے دشمنوں میں بھی سچا اور دیانتدار مانا گیا وہ انسانِ کامل ہے جو خاتم الانبیاء اور رحمتہ للعالمین ہے۔ قرآنی فکر و عمل اپنانے سے ایک ناچیز انسان بھی ارجمند اور سعادت مند بن جاتا ہے ۔ قرآن ہی ایک معبود کا سجدہ سکھا کر انسان کو ہزار طرح کی جبہ سائیوں سے نجات دلاتا ہے اور یوں قرآن انسان کو حقیقی سربلندی بخش کر سرفراز کرتا ہے واقعاً یہی قرآن آدابِ جہانبانی سکھانے کا لاثانی آئین بھی ثابت ہوگیا ہے۔ قرآنی مقناطیسیت کردار میں پیدا ہونے کی دیر تھی کہ جمشید وفریدوں او قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج غازیوں کے قدموں میں آ گئے ۔ اے ننگِ ملت اور ننگِ اسلاف بن کر آج اپنے ایمان کو اغیار کی رسموں میں رنگنے والے نادانو ذرا ہوش میں آجاؤ یہ کیسی سیاہ بختی ہے کہ آج تمہیں کافرانہ اداؤں نے اپنا اسیر بنا رکھا ہے۔ اگر تم واقعاً مسلمان بن کر زندہ رہنا چاہتے ہو تو پھر یہ بات غور سے سنو کہ تم یہ مقصد قرآن کو اپنا دستور العمل بنائے بغیر ہرگز پورا نہیں کر سکتے۔ اے قرآن کی تلاوت پر اکتفا کرنیوالے شخص اس خاص آسمانی کتاب کو تم پر اعمال کی سطح پر بھی خاص حق حاصل ہے۔ اگر تم وہ حق ادا کرو گے تو پھر کونسی مُراد ایسی ہے جو تم اس کی بدولت حاصل نہ کر سکو گے''۔

تعارفِ قرآن کے طور پر تخلیق کئے گئے مذکورہ اشعار کا یہ ترجمہ اور خلاصہ سن کر آپ کو بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ شاعر نے کس قطعیت اور جامعیت سے کام لے کر قرآنِ حکیم کی ازلی برکت' ابدی معنویت اور دائمی اہمیت کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ قرآن مجید کے ان پہلوؤں کو دوسری تصانیف میں کس طرح مزید اجاگر کیا گیا

ہے۔اس کونظر میں لانے سے پہلے ہم رموزِ بیخودی کے اس اختتامیہ کے چند شعروں پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈالیں گے۔جن کوعرضِ حالِ منصف بحضور رحمتہ للعالمین ؐ جیسا عنوان دیکر ایک مثنوی پارہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔نظم منجملہ اور باتوں کے خاص طور پر شاعر کی اس ہیجانی کیفیت کی عکاسی بھی کرتی ہے جو اسرارِ خودی کے ردعمل میں طوفان بپا کرنے والے چند مُلایانِ وقت اور شیخانِ دلی کی طرف سے ہونے والے رقیق حملوں کے نتیجے میں دلِ شاعر میں پیدا ہوگئی تھی۔آپ جیسے اقبال شناس حضرات سے یہ بات کب پوشیدہ ہوگی کہ اسرارِ خودی کے خلاف ظاہر کئے گئے اس شدید ردعمل کے اصلی اسباب کیا تھے جس کی رُو سے ؎

الحذر از حافظ صہبا گسُار
جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار

جیسے مطلع والی نظم کو آڑ بنا کر اقبال کو گردن زدنی قرار دیا گیا تھا۔اور جس کو وجہِ فساد بنا کر خواجہ حسن نظامی جیسے خانقاہ نشین قلمکاروں نے اقبال پر ایسی سنگباری کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا تھا کہ اکبر الہ آبادی جیسے روشن فکر دیندار شاعر اور با اثر بزرگ طنز نگار بھی علامہ کی مدافعت میں متوقع رول ادا نہ کر سکے تھے بلکہ وہ بھی دوسروں کی طرح ہی مصلحت کوشی سے کام لے کر صرف اتنا کہنے پر اکتفا کر گئے تھے کہ ؎

نیچری دینِ مہذب کو لئے پھرتے ہیں　　شیخ صاحب ہیں کہ مذہب کو لئے پھرتے ہیں
ہم کو ان تلخ مباحث سے سروکار نہیں　　ہم تو ایک شوخ شکر لب کو لئے پھرتے ہیں

اب اگر یہ دیکھنا ہو کہ روحِ قرآن کے رجز خوان اقبال کو ہیجانی کیفیت میں مبتلا کرنے والے معاصر شیخ صاحب کو خود اقبال کس بڑے جُرم کا مرتکب گردانتے تھے تو مذکورہ اختتامی نظم کے بعض شعروں پر خاص توجہ مبذول کرنا ہوگی۔بہر حال اقبال کے خاص قلبی تلاطم اور صالح اعتقاد کی کئی باریک باتیں بین السطور سمجھانے والی ۶۵ اشعار

پر مشتمل اس تخلیق میں سے بھی میں فقط یہ آٹھ اشعار پیش کرتا ہوں:۔

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی　　جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
مسلم از سرِ نبیؐ بیگانہ شُد　　باز ایں بیت الحرم بُتخانہ شُد
شیخِ ما از برہمن کافر ترست　　زانکہ اورا سومنات اندر سرست !
مُردہ بود از آبِ حیواں گفتمش　　سرے از اسرارِ قرآن گفتمش
گفت برمابندد افسونِ فرنگ　　ہست غوغالیش زقانونِ فرنگ
اے فروغت صبحِ اعصار و دہور　　چشم تو بینندۂ مافی الصدور
گردِلم آئینہ بے جوہر است　　وربحر فم غیرِ قرآن مضمر است
روزِ محشر خوارو رُسوا کُن مرا　　بے نصیب از بوسۂ پاکن مرا

(ا) مولانا جامیؒ نے علامہ اقبال سے کئی صدیاں پیشتر شیخِ حرم اور شیخ الاسلام جیسے عہدوں پر فائز ہونے والے بعض ریاکار دینی عالموں کے بارے میں اپنے تجربات یوں بیان کئے ہیں۔

شیخِ خود بین کہ بہ اسلام برآمد نامش　　نیست جزُ زرَق وریا قاعدۂ اِسلامش
خویش را واقفِ اسرار شناسد لیکن　　نہ ز آغاز وقوفست نہ ازانجامش
دامِ تزویر نہادست' خدا رامپسند　　کہ فِتد طائرِ فرخندۂ مادردامش

یہ اشعار اس بات کے آئینہ دار ہیں کہ ایک ہیجانی کیفیت کے زیر اثر مجبورِ نوا ہو کر شاعر دربارِ رسالتؐ میں نہ صرف روحِ قرآن کو نظر انداز کرنے والے علمائے دین اور شیخانِ حرم کے خلاف جوابی استغاثہ پیش کرتا ہے بلکہ آہوں اور آنسوؤں میں ڈوب کر ان کی طرف سے لگائے جانے والے بے بنیاد الزمات سے متعلق حلفاً اپنی صفائی بھی پیش کرتا ہے۔ جس طرح حافظ سے متعلق مشہور اور متنازعہ فیہ نظم میں شاعر کی مراد ہرگز یہ نہ تھی کہ وہ حافظ شیرازی پر عرفی شیرازی کو ترجیح دینا چاہتا تھا اسی طرح سے شاعر کا مدعا

تصوف یا اس کے خانقاہی نظام کی سابقہ دینی خدمت کو رد کرنا نہ تھا۔ بلکہ ایک عرصہ تک عرفان وآگہی کی تربیت گاہوں کا رول انجام دینے والی اور فقر کے شاہبازوں کی سکونت گاہوں کا درجہ رکھنے والی وہی خانقاہیں انتہائی زوال پذیر ہوکر واقعاً ہوس کے زاغ وزغن کے ایسے مسکنوں میں تبدیل ہوگئی تھیں۔ جہاں امتِ مسلمہ کو باضابطہ افیون کھلانے اور گوسفندیت سونپنے کیلئے روحِ قرآن کو سب سے زیادہ تختۂ مشق بنایا جارہا تھا۔ پھر طرہ یہ کہ صالحین کے وہی سیاہ دل ورثا دردمند ملی شاعر کو دین دشمن قرار دینے پر کمر بستہ ہو رہے تھے۔ اور یہ سب کچھ اسلامی خدمت کے نام پر ہورہا تھا تاکہ ان کی تن آسانی اور عیش کوشی کے ٹھکانے منہدم نہ ہونے پائیں۔ اس طرح کا بدباطنی پر مبنی ردعمل دیکھ کر جو گہرا زخم شاعر کے دل کو لگا وہ عمر بھر رستا رہا کیونکہ ہدفِ تنقید بنائے گئے دنیا پرست دین داروں کے اس بدبختانہ روئے میں چنداں تبدیلی رونما نہ ہوسکی۔ جو رویہ انہوں نے روحِ قرآن کے تئیں اختیار کرلیا تھا۔

یہاں پر ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ خطرناک ردعمل سے دبنے کے بجائے ملی شاعر اپنے تلخ تجربے کو ایک مستقل اور حاوی شعری موضوع کا درجہ دے دیتا ہے اور اپنا قلمی جہاد جان کر وہ اپنے تخلیقی ذہن کے ارتقاء پذیر ہونے کے ساتھ ساتھ اس موضوع میں بھی نیا رنگ اور نیا زور پیدا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اس موضوع کے اظہار کی لے بانگِ درا میں نسبتاً مدہم، ملائم اور ملفوف ہے جب وہ یزدانی الفاظ میں جوابِ شکوہ کا یہ بند تخلیق کرتے ہیں۔

ہر کوئی مستِ مے ذوقِ تن آسانی ہے — تم مسلمان ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے نہ دولتِ عثمانی ہے — تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے
وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہوکر — اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہوکر

آگے چل کر یہی دردمندانہ اظہار شدت اختیار کرکے ضربِ کلیم میں کہیں یہ

صورت اختیار کرتا ہے

اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم — جس نے مومن کو بنایا مہ و پروین کا امیر

اور کہیں ایسی طنزیہ صورت میں:۔

ہے کس کو یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے — حریتِ افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبے کو آتشکدۂ فارس — چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر — چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

قرآن کی روح کو مجروح اور نظر انداز کئے جانے کی تاویل پسندانہ کاروائیوں کے خلاف دلِ شاعر سے بلند ہونے والی صدائے احتجاج ارمغانِ حجاز میں اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے جب وہ کہتے ہیں:۔

زمن بر صوفی و ملا سلامے — کہ پیغامِ خدا گفتند مارا
ولے تاویل شان در حیرت انداخت — خدا و جبرئیل و مصطفیٰؐ را

علامہ اقبال کے کتنے ہمعصر علماء وفضلاء بڑے پیمانے پر قرآن کو بازیچۂ تاویلات بنانے کے مرتکب ہو رہے تھے انکی واضح نشاندہی الگ سے زیر بحث لائی جاسکتی ہے۔ البتہ ملی شاعر اس ضمن میں آئے دن ہونے والے نت نئے تلخ تجربے کو زوردار ڈھنگ سے اظہار میں لانے کا سلسلہ برابر جاری رکھتا ہے۔ مثلاً ضربِ کلیم کی مذکورہ دلسوزی کی صدائے بازگشت جہاں اللہ سے مخاطب ہو کر کہے گئے بال جبریل کے اس شعر میں سیدھے سنائی دیتی ہے

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر — تاویل سے قرآن کو بنا سکتے ہیں پازند

وہاں تفسیرِ قرآن پر اکتفا کرنے والے کو روحِ قرآن تک رسائی پانے کا راز بھی یوں سنایا جاتا ہے

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب — گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

ملی شاعرِ امتِ مسلمہ کی قرآن کیساتھ روا رکھی گئی کج نظری دیکھ کر کبھی تڑپ کر یوں طعنہ زن ہوتا ہے کہ ؎

زمین کیا آسمان بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے　　غضب ہے سطرِ قرآن کو چلیپا کر دیا تو نے

اور کبھی ایک مشفق ملی شاعر کی حیثیت سے احساسِ زیان پیدا کرنے کیلئے روحِ محمدؐ کا واسطہ دیکر اپنا رویہ قرآن کے تئیں درست کرنے کی تحریک یوں دیتا ہے ؎

آنچہ تو باخویش کردی کس نکرد　　روحِ پاکِ مصطفیٰ آمد بدرد

قرآن جیسے تقدیر ساز کیمیائی نسخے اور مکمل ضابطہ کے تئیں مسلمانوں کی اس کج بینی اور لاپروائی کی اصل وجہ کیا ہے۔ جب اقبال سے یہ بات پوچھی جاتی ہے تو وہ افغانی دیوانے کے الفاظ میں جھٹ بول اٹھتے ہیں

صدق و اخلاص و صفا باقی نماند　　آں قدحِ بشکست و آں ساقی نماند

اس جواب کی واضح تر صورت یوں بھی ابھرتی ہے کہ

در نفس سوزِ جگر باقی نماند　　لطفِ قرآنِ سحر باقی نماند

یاں یوں

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا　　کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

بہر حال ایسے درجنوں اشعار کہہ کر ملی شاعر اپنے قارئین کو یہ بات محسوس کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ دراصل روحِ قرآن کے تئیں مسلمانوں کی بے حسی ہی ان کی سب سے بڑی بیماری کی بنیادی وجہ ہے اب اگر مسلمان اس بیماری کا کوئی کارگر علاج علامہ اقبال یا اس کے مرشد سے پوچھنے کی ضرورت محسوس کریں گے تو وہ یہ سوچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ایک حکیمِ حاذق صرف مرض کی تشخیص نہیں کرتا ہے بلکہ اس کے علاج کے لئے دوا بھی تجویز کرتا ہے یا پہلے سے موجود کیمیائی نسخے کو صحیح ڈھنگ سے مصرف میں لانے کی خاص ترکیب بھی حالت مریض کی رعایت سے پیش

کرتا ہے لہٰذا اگر ہم اس ضمن میں مولانا رومیؔ سے رجوع کریں گے تو وہ فقط اتنا کہہ دینا کافی سمجھیں گے کہ

معنئ قرآن ز قرآن پُرس و بس　　وز کسے کآتش زدہ اندر ہوس

بحثِ جاں اندر مقامِ دیگر است　　بادۂ جان از قوامِ دیگر است

البتہ اگر اقبال کے ارتقاء پذیر تخلیقی ذہن سے ہمیں یہ جواب مطلوب ہو تو ہمیں جاوید نامہ، پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق، مُسافر اور ارمغانِ حجاز جیسی تصانیف میں شامل کئی فکر انگیز اشعار کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

لیکن ان دونوں حکیموں سے پہلے قرآنِ حکیم کی اُس واضح تشخیص کو بھی ملحوظِ نظر رکھنا ہوگا جو "معنئ قرآن زِ قرآن پُرس و بس" جیسے مشورے کا آغاز سورۃ آل عمران کی اِن آیاتِ بیّنات میں کرتی ہے:۔

"..........لا اِلٰہ الّا ھُوَالعزیزُ الحکیمُ۔ ھُوَالَّذِیۡ اَنۡزَلَ عَلَیۡکَ الکِتَابَ مِنۡہُ آیٰتٌ مُحۡکَمٰتٌ ھُوَّ اُمُّ الکِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِہٰت۔ فَاَ مَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡ بھِم زیغ فیتبعوۡن ماتَشَا بَہَ مِنۡہُ ابتغآءَ الفتنۃ وابتغاءَ تاوِیلہ۔ وَمَا یَعۡلَمُ تاوِیۡلَہٗٓ اِلَّا اللہُ۔ وَالراسخُوۡنَ فی العِلۡمِ یَقُولُونَ اٰمَناً بہٖ کُلٌّ مِنۡ عِنۡدِ ربنا و ما یذ کر الا اولوا الا لبابِ۔

ترجمہ : کسی کی بندگی نہیں اللہ کے سوا۔ وہ زبردست حکمت والا ہے وہی ہے جس نے آپ پر یہ کتاب نازل کی۔ اس میں بعض آیتیں واضح و (محکم) ہیں اور وہی اس کتاب کی اصل اور مغز ہیں جبکہ بعض دوسری آیتیں متشابہ ہیں یعنی جن کے معانی معلوم یا معین نہیں ہیں۔ جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ انہی متشابہات کی پیروی کرتے ہیں وہ بھی متشابہات کی گمراہی پھیلانے کی غرض سے اور اپنی خواہش کے مطابق معنی

نکالنے کی غرض سے۔ حالانکہ ان آیتوں کا مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ان لوگوں کے برعکس راسخ علم رکھنے والے لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ سب آیتیں ہمارے رب کی طرف سے اُتری ہیں۔ یوں حق بات کو وہی سمجھتے ہیں جن کہ عقلِ سلیم والوں میں شامل ہونے کی سعادت ملتی ہے''۔

ان آیات کی روشنی میں جہاں مولانا کے اس تاثر کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ جس نے اس معرکۃ الآرا شعر کا روپ دھار لیا ہے:

مغزِ قرآن از قرآن برداشتم اُستخواں بہرِ سگان بگذاشتم

وہاں محکمات کے ذریعے روحِ قرآن تک رسائی پانے والوں کو وہ عالم نو تعمیر کرنے کی بات کہنے کی سعادت بھی نصیب ہو جاتی ہے۔ جس کا پتہ جاوید نامہ میں علامہ اقبال نے سید جمال الدین افغانی سے ان الفاظ میں پوچھا ہے

ز ورقِ ماخاکیاں بے ناخداست کس نداند عالمِ قرآن کجاست؟

یہ سوال سن کر حضرت افغانی محکماتِ قرآن کا عرفان بخش کر علامہ اقبال کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں اس کا خاکہ یہ ہے:

عالمے در سینہ ی ماگمُ ہنوز عالمے در انتظارِ قمُ ہنوز
عالمے بے امتیازِ خون و رنگ شام او روشن تر از صبحِ فرنگ
باطنِ او از تغیّر بے غمے ظاہرِ او انقلابِ ہردمے
اندرونِ تست آں عالم نگر مے دہم از محکماتِ او خبر

یعنی اے پیارے اقبال عالمِ قرآن کی تشکیل نو کا خاکہ یا بجائے خود ایک نیا عالم ابھی تک ہمارے سینوں میں پوشیدہ ہے البتہ وہ عالم ہماری طرف سے قمُ باذنِ اللہ سننے کے انتظار میں ہے۔ عالمِ قرآن امتیاز رنگ و نسل سے پاک ہوگا اس کی جھلک دیکھ کر تہذیبِ حاضر کی ساری چمک دمک شرمائے گی۔ عالمِ قرآن کا باطنی نظام راسخ

عقیدہ اور ایمان کی بدولت غیر مبدل ہوگا۔ البتہ اسکی ظاہری فتوحات وخدمات کا نظام ہر لمحہ تغیر پذیر اور سرگرمِ عمل ہوگا۔ وہ عالم خود تمہارے اندر موجود ہے۔ اگر تو قرآن کے محکمات پر غور کرے جن کی واقفیت میں بہم پہنچانے جارہا ہوں۔ یہ کہہ کر حضرت افغانی شاعر کو تخیلی سفر کے دوران محکماتِ عالمِ قرآنی کے نام پر چار ذیلی عنوانوں کے تحت روحِ قرآن سے متعارف کراتے ہیں۔ وہ چار ذیلی عنوان ہیں۔ خلافتِ آدم، حکومتِ الٰہی، ارضُ ملکِ خدا ست اور حکمت خیرِ کثیر است۔

علامہ اقبالؒ محکماتِ قرآنی کی ایک نئی ہی توجیہہ اور تعبیر سن کر سوچتا ہے کہ اگر قرآنی تعلیمات ایسے تقدیر ساز امکانات کی حامل ہیں تو اِنکی امانت دار ملت کیوں اس قدر مایوس کن واقع ہورہی ہے وہ ابھی یہی سوچ رہا ہوتا ہے کہ یا مسلمان مُردیا قرآن بمُرد۔ جب سعید حلیم پاشا اس کے سامنے جگہ جگہ نظر آنیوالے قرآن فروش مسلم لیڈروں کی مجموعی روش کی نشاندہی ان الفاظ میں کرتا ہے

ازشگر فیہایِ آن قرآن فروش	دیدہ ام رُوح الامین رادر خروش
زانسویِ گردوں دِلش بیگانہ ی	نزدِ اوامُ الکتاب افسانہ ی
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ	آسمانش تار از بے کو کبی
کم نگاہ و کور ذوق وہرزہ گرد	ملت از قول و قرارش فرد فرد
مکتب وُملّاو اسرارِ کتاب	کور مادر زاد و نورِ آفتاب

معاصر مسلم دشمن عناصر کیلئے جس طرح شاعرِ مشرق نے بتکرار "فرنگ" اصطلاح استعمال کی ہے اسی طرح سے خود مسلمانوں میں موجود مسلم دشمن عناصر کو وہ بتکرار "قرآن فروش" ترکیب سے یاد کرتے ہیں انہی قرآن فروش عناصر کی تنگ نظری، کور ذوقی اور دین دشمنی کو محکمات قرآنی کی روح پنپنے نہ دینے کا ذمہ وار ٹھہرا کر شاعرِ مشرق سعید حلیم پاشا کی زبانی یہ تلخ حقیقت بھی بیان کراتا ہے کہ

دینِ کافر فکر وتدبیر وجہاد دینِ مُلّانی سبیل اللہ فساد

اس دلخراش صورت حال میں بھی اقبال کی نظر میں پوری دنیا کے کرب واضطراب کا علاج فقط اس بات میں مضمر ہے کہ مزید تاخیر کئے بغیر قرآنی محکمات کی بنیاد پر ایک عالمِ نو تعمیر کرنے کا تقاضا پورا کیا جائے کیونکہ مشرق ومغرب میں نافذ کئے جانے والے سارے نظرِئے یکے بعد دیگرے اپنے کھوکھلے پن کا اعلان کرتے جارہے ہیں۔ یہاں تک کی بظاہر بہت امید افزا لگنے والا تازہ دم کمیونزم بھی اپنی باہری چمک دمک کے باوجود دُکھی انسانیت کا مداوا نہ بن سکے گا۔ کمیونزم کے آغاز سفر کے وقت پورے اعتماد سے یہ سب کچھ کہہ جانا شاعرِ مشرق کی قرآنی بصیرت اور دینِ اسلام کی حقانیت کا ایک برملا اعلان ہے۔ چنانچہ حضرت سید جمال الدین افغانی کی زبان سے روسیوں کو مخاطب کر کے کہلواتا ہے کہ اگر تم روسیوں نے ہمارے اسلاف کا جیسا محنت پسندی اور سخت کوشی کا آئین عملاً اختیار بھی کرلیا ہے اور شخصی حکومتوں کو الٹ کر جمہوری نظام کی تشکیل نو کا اعلان بھی کر دیا ہے تاہم خدا اور اس کے آخری پیغمبرؐ پر یقین کا عقیدہ اپنائے بغیر تمہاری یہ ساری عمارت ریت کی عمارت ثابت ہوجائے گی۔ اندازہ لگائے کہ بیسویں صدی کے سب سے بڑے انقلاب کے بارے میں آغازِ سفر دیکھ کر ہی یہ پیشگوئی علامہ اقبال نے کیونکر کی ہے۔ اس کو فیضانِ قرآن اور حقیقی نورِ عرفان کے بغیر کوئی دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا۔ شاعرِ مشرق کی پیشگوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوجانے کا نظارہ پچھلے سال بچشم خود ملاحظہ کرنے کے بعد اب ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ روس کی شکست وریخت کے بعد وہ کس قرآنی عالم نو کا نقشہ ابھرتے دیکھ چکے ہیں کہتے ہیں:

کس نمے داند زاسرارِ کتاب شرقیاں ہم غربیان درپیچ وتاب
منزل ومقصودِ قرآن دیگر است رسم وآئینِ مسلمان دیگراست

بندۂ مومن ز قرآن بر نخوُرد | در ایاغِ اونہ مے دیدم نہ دُرد
توکہ طرحِ دیگرے انداختی | دل زدستورِ کہن پر واختی
ہمچو ما اسلامیان اندر جہاں | قیصریت راشکستی استخوان
پائے خودمحکم گذار اندر نبرد | گرد این لات وہبل دیگر مگرد
ملتے میخواہداین دنیا ئے پیر | آنکہ باشد ہم بشیرو ہم نذیر
درگذر از لا اگر بینندۂ ی | تارہِ اثبات گیری زندہ ای
داستانِ کہنہ شستی باب باب | فکر را روشن کن ازاُمّ الکتاب
جزُ بقرآن ضیغمی روباہی است | فقرِ قرآن اصلِ شاہنشاہی است
فقرِ قرآن اختلاطِ ذکر وفکر | فکر را کامل ندیدم جزّبذِکر
چیست قرآن خواجہ را پیغامِ مرگ | دستگیر بندہ ی بے ساز وبرگ
ہیچ خیراز مردکِ زرکش مجوُ | لَن تَنَا لُو البِرّ حتیٰ تُنفِقوُا
نقش قرآن تادرین عالم نشست | نقشہایِ کاہن وپاپا شکست
فاش گویم آنچہ دردل مضمر است | این کتابے نیست چیزے دیگر است

خواہ حکیم سنائی ہوں یا مولانا رومی، شیخ فریدالدین عطار ہوں یا شیخ نورالدین کشمیری، مولانا حالی ہوں یا مولانا علامہ اقبال۔ ایک ملی شاعر بہرحال اپنے دور میں دو خاص کام انجام دیتا ہے ایک یہ کہ وہ اپنے زمانے میں ابھری ہوئی کسی بڑی غیر اسلامی طاقت سے ملت کو مرعوب نہیں ہونے دیتا۔ دوئم یہ کہ وہ بیمار ملت کو شدید مایوس کن حالات میں بھی اپنے حکیمانہ مشوروں سے امیدِ فردا مستحکم بناتا ہے۔ گویا اگروہ تشخیص کی سطح پر حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر بے حسی کی افیون کھلانے والے زعماء اور اِداروں کی بڑی بیباکی سے نشاندہی کرتا ہے تو ساتھ ہی وہ علاج کی سطح پر سنگین رات سے رنگین صبح بر آمد ہونے کی بات بھی انتہائی مؤثر ڈھنگ سے کہتا ہے اور یوں دیدۂ بینائے قوم بن

کروہ ملت کے احیاءِ نو اور بحالیٔ وقار کے تازہ امکانات روشن کرتا ہے۔ بلکہ وہ احیاءِ نو کا چراغ جلانے کے آداب سکھانے کے ساتھ ساتھ اسکو بُجھانے کیلئے سرگرم ہو سکنے والی تمام ممکنہ مختلف النوع طاغوتی قوتوں کو بھی قبل از وقت نظر میں لاتا ہے اور پیش بینی کے تحت ہی ملّت کو حفظِ ماتقدم کے اشارات بھی بہم کرتا ہے۔ علامہ اقبالؔ کی نظر بھی ایسے معاملات اور خطرات پر جاتی ہے ۔اس ضمن میں آپ کے محسوسات کا عمدہ اظہار آپکی آخری تصانیف میں بہتر ڈھنگ سے ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ابلیس کے اس شاطرانہ بیان کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو بیان اپنے مشیروں کے سامنے امکانی عالمِ قرآن وشریعت کو ابھرنے نہ دینے سے متعلق وہ یوں دیتا ہے:

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآن نہیں — ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دین
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں — بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستین
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف — ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر — حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفرین
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے — نے کوئی فغفور و خاقان نے فقیرِ رہ نشین
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف — مُنعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امین
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمین
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئین تو خوب — یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقین
ہے یہی بہتر اِلٰہیات میں اُلجھا رہے — یہ کتابِ حق کی تاویلات میں الجھا رہے

ایک ملّی شاعر بُنیاداً ایک شاعرِ قرآن ہوتا ہے۔ اسلئے وہ روحِ قرآن کو پہچاننے ، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے تئیں مجتہدانہ توجہ کرنے ،فقرِ قرآن اختیار کرنے یعنی سادگی پاکیزگی اور ایثار و غیرت پر مبنی معاشرہ کی تشکیل نو کیلئے انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریاں نبھانے کے آداب سکھانے اور یوں بتقاضائے

تعلیماتِ قرآن شرعی نظام کی بحالی وقیام کیلئے تعاون پیش کرنے کا مشورہ دینا اپنی شاعری کا فرضِ منصبی گردانتا ہے۔ علامہ اقبالؔ پس چہ باید کرد مثنوی کے اشعار میں یہی کچھ کرتے نظر آتے ہیں مثلاً ان اشعار میں :

اے کہ مے نازی بہ قرآنِ عظیم — تا کجا در حُجرہ مے باشی مقیم
فقرِ قرآن ذوق و تسلیم و رضاست — ما امینیم این متاعِ مصطفیٰؐ است
برگ و سازِ اوزِ قرآنِ عظیم — مردِ درویشے نگنجد در گلیم
فقرِ قرآن احتسابِ ہست وبود — نے رباب و مستی ورقص و سرود
از شریعت احسن التقویم شو — وارثِ ایمانِ ابراہیم شو

علامہؒ اقبال قرینے سے قرآنِ عظیم کو امت مسلمہ کا آبِ حیات اور یدِ بیضا قرار دینے کے بعد "مسافر" نام کی مثنوی میں پیشِ نظر عالمِ قرآن کی مُتخلیہ صورت کے خاکے میں رنگ بھرنے کیلئے دو باتوں کو اساسی اہمیت دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ جدید علوم وحکمت یعنی سائنس اور ٹکنالوجی کو اپنی متاعِ گُم گشتہ قرار دیکر مسلمانوں کے لئے اس میں مہارتِ تامہ حاصل کرنا لازمی سمجھتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ مذکورہ مثنوی سے پیشتر بھی اشارے بہم کرچکے ہیں چنانچہ سنائی اور رومی کی طرح وہ بھی قرآنی یا مغزِ قرآنی کی آئینہ دار آیات کو تلمیحاتی ڈھنگ سے اپنے شعر کا حصہ بنا چکے ہیں مثلاً

نکتہٗ اِلّا بسلطان یاد گیر — ورنہ چون مور وملخ در گِل بمیر

دوسری اہم بات مسلم اُمہ کے بکھرے ہوئے دانش وروں کو مسلکی اختلافات سے اوپر اٹھ کر اور اپنے فکر وعمل کو اللہ کے رنگ میں رنگ کر یکجا ہونے سے تعلق رکھتی ہے۔ ان دونوں اساسی باتوں کی عکاسی کرنے والے اور عالمِ قرآن کی تشکیل کو نزدیک محسوس کرانے والے چند شعر پیش کرتے ہوئے یہ مقالہ ختم کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ ملاحظ فرمایئے یہ اشعار:۔

بر درونِ شاخِ گُل دارم نظر غنچہ ہارا دیدہ ام اندر سفر
صد جہاں باقی است در قرآن ہنوز اندر آیاتش یکے خود را بسوز
برگ و سازِ ما کتاب و حکمت است این دو قوت اعتبارِ ملّت است
آن فتوحاتِ جہانِ ذوق و شوق این فتوحاتِ جہانِ تحت و فوق
ہر دو انعامے خدائے لایزال مومناں را آن جمال است ایں جلال
حکمتِ اشیاء فرنگی زاد نیست اصلِ او جز لذتِ ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلمان زادہ است این گہُر از دستِ ما افتادہ است
برخور از قرآن اگر خواہی ثبات در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات
می دہد مارا پیامِ لاتخف می رساند بر مقامِ لاتخف
گوہر دریائے قرآن سُفتہ ام شرح رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام

فارسی سے یکسر دور ہو گئے ہوئے احباب کے لئے ان اشعار کا ترجمہ بھی پیش کیا جاتا ہے ان میں شاعر اپنی بصیرت کے حوالے سے کہتا ہے کہ مجھے اپنے باغ کی ٹہنیوں میں چھپے ہوئے کاروانِ شوق پر بھی نظر ہے میں نئی امید کی کلیوں کو اس کاروان میں گرمِ سفر دیکھ رہا ہوں شاعر کی معرفت کا وہ باغ قرآن پاک ہے اور وہ امید افزا ٹہنیاں اسکی آیتیں ہیں چنانچہ دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ آج کے بعد نمودار ہونے والی امکانات کی سینکڑوں دنیائیں ابھی قرآن میں موجود ہیں تم ان کا ادراک حاصل کرنے کے لئے آیاتِ قرآن کے نور پر پروانہ وار جلنا سیکھو گویا اس شعر میں شیخ العالمؒ کے ان مصرعوں کی صدائے بازگشت سیدھے سنائی دیتی ہے جن میں جلنے کا تقاضا روشن کر کے منصور کا نام لے کر کہا گیا ہے۔ قرآن پران دوٗد منصور۔ قرآن پران گوینا سوٗر؟ رومی سے آگے بڑھتے ہوئے اسی قرآنی عرفان کا تسلسل تیسرے شعر میں شاعر کو قطعیت کے ساتھ یہ دعوی کراتا ہے کہ ہمارے سب سے اہم سامانِ حیات کا درجہ قرآن اور اس

سے وابستہ حکمت کو حاصل ہے اور ان ہی دو قوتوں پر ملّت کے وقار کا انحصار ہے۔ قرآن کا نور فتوحاتِ روح و نفس کرنے کا ذوق و شوق پیدا کرتا ہے جبکہ حکمت و علم کا نور خارجی فتوحات کے امکانات کو روشن کرتا ہے۔ قران اور حکمت خدائے لایزال کے عطا کردہ دو ایسے انعامات ہیں جو حقیقی مومنوں کے جمال اور جلال کے آئینہ دار ہیں۔ شاعر نے دوسری جگہ ایک حدیث کی روشنی میں علم و حکمت کو مومنوں کی اپنی کھوئی ہوئی میراث جان کر اس کو چین جیسی دور اور پرائی جگہ جا کر یکدم حاصل کرنے کا مفہوم بھی یوں واضح کیا ہے۔

گفت حکمت را خدا خیرِ کثیر ہر کجا این خیر را بینی بگیر

چھٹے شعر میں مغربی علم و حکمت کے سرچشمے مسلمان ہونے کی تاریخی صداقت بیان کی گئی ہے یہ کہہ کر کہ علم کیمیا یورپیوں کی دین نہیں ہے البتہ اس مسلم زاد حکمت کیلئے ذوق ایجاد کو زندہ رکھنا لازمی ہے۔ اگر غور سے دیکھو گے تو ساری مغربی ایجادوں کے پس پردہ مسلم سائنسدانوں کی دَین محسوس کرو گے۔ اے کلمہ خوانو پھر قرآن سے اکتسابِ نور کرو اگر تم عزت اور بقا چاہتے ہو۔ میں نے قرآن کے ضمیر میں ہی آبِ حیات چھپا دیکھا ہے۔ قرآن ہمیں خدا کے بغیر کسی اور سے نہ ڈرنے کا پیغام دیتا ہے اور اسی کی تعلیمات ہمیں شجاعت کے مقامِ لاتخف تک پہنچا سکتی ہیں بہر حال میں نے تخلیقِ شعر کے عمل سے قرآن کے موتی پرونے کی کوشش کی ہے اور تمہارے سامنے اللہ کے رنگ میں اپنی شخصیتوں کو رنگنے کے آداب شرح وبسط کے ساتھ بیان کر دیئے ہیں۔

☆☆☆

فارسی نعتیہ ادب۔ اقبال کو حجازی لے

سے نوازنے والے سوز وساز کا ممتاز سرچشمہ

بیا اقبال جامے از خمستانِ خودی درکش　　تو از میخانۂ مغرب زِ خود بیگانہ مے آئی

برصغیر کے مایۂ ناز شاعر اقبال کے سب سے بڑے ذریعۂ اظہار کا شرف اُس ایرانی زبان کو حاصل رہا ہے جو اپنی خاص شیرینی اور مٹھاس کے حوالے سے فارسی کے علاوہ قندِ پارسی نام سے بھی مشہور ہوئی ہے۔ اِس زبان کو کئی اور خاص باتوں کے علاوہ یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ قرآن کی زبان عربی کے بعد معیار اور مقدار دونوں کے اعتبار سے نعتیہ ادب کا گرانقدر سرمایہ اولاً اِسی کو خصوصیت کیساتھ نصیب ہوگیا ہے۔ جس کا اعتراف امیر خسرو سے مرزا غالب تک ہمارے آسمانِ ادب پر ضیابار ہوگئے ہوئے عظیم شعراء نے ہی نہیں کیا ہے بلکہ ہمارے جلیل القدر دینی عالموں، تہذیب شناس اِسکالروں اور عالمی شہرت یافتہ دانشوروں نے بھی کیا ہے۔ اِس ضمن میں اپنے ممتاز ہم عصر مولانا سیّد علی ندوی المعروف علی میاں کا حوالہ دینا کافی ہوگا۔ اپنے ایک عربی مقالے میں (مولوی محمد الحسنی کے ترجمے کی رُو سے) یوں رقمطراز ہوئے ہیں:

> ''جو اہلِ نظر اسلام کے عالمی ادب سے باخبر ہیں اور جنہوں نے مختلف ملکوں اور مختلف قوموں کی زبان و ادبیات کا مطالعہ کیا ہے اور اُس کے اشعار سے لطف اندوز ہوئے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ فارسی زبان نعت گوئی اور مدحِ رسولؐ میں سب سے زیادہ خوش نصیب اور سرمایہ دار ہے۔ اُس کے بعد اُردو زبان کا نمبر آتا ہے۔ جو خود فارسی ادب کی خوشہ

چین بلکہ ایک لحاظ سے اس کی پیداوار ہے یہی وجہ ہے کہ اس موضوع پر جتنا طاقت ور، زندہ، مؤثر، نرم و شیریں اور پُرسوز کلام اِن دونوں زبانوں میں ملتا ہے اُتنا کسی اور زبان میں نہیں ملتا۔ اس میں جذبات کی جو فراوانی اور گرمی و بے چینی نظر آتی ہے وہ دوسری ادبیات میں نظر نہیں آتی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ عجمی نژاد شعراء نے ..... ایسے مضامین اور خیالات پیش کئے اور ایسی نئی نئی تعبیریں ایجاد کیں جن میں اُس کا پیشرو کوئی نہ تھا۔ یہ ادبیات اِسلامی کی تاریخ کا ایک علمی سوال ہے جس کا ابھی تک تشفی بخش جواب نہیں دیا گیا۔ بعض اہلِ نظر نے اس کی یہ توجیہہ کی ہے کہ اس کا تعلق ایرانی اور ہندوستانی مزاج سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اہلِ ایران اور اہلِ ہند دونوں کے خمیر میں عشق و محبت شامل ہے اور اُن کی افتادِ اِسی (عشقِ رسولؐ) پر ہوئی ہے۔ اس لئے اُن کی زبان بھی شوق و آرزو کی زبان اور عشق و محبت کی ترجمان ہے۔ جب اِس صلاحیت کا رُخ ایک ایسی شخصیت کی طرف ہو جس کو حُسن و احسان کا سب سے بڑا پیکر اور جمال و کمال کا سب سے لطیف مظہر کہنا ہر طرح بجا ہے تو اُس نے قدرتی طور پر اپنے کلام کے ایسے عجیب و غریب اور نادر نمونے پیش کئے جو اُسی کے ساتھ مخصوص ہوں۔ زورِ تعبیر اور حُسنِ تصویر نے جذبۂ محبت، بے تابیٔ دل اور تاثیرِ عشق کے ساتھ مل کر اپنے محبوب و ممدوح کی تعریف میں (جن کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی محبت کی جلوہ گاہ بنایا ہے اور ظاہری و باطنی جمال کی سب سے قیمتی پوشاک سے نوازا ہے) ایک ایسا سماں باندھا جس میں دل آویزی اور دلربائی کا پورا سامان موجود تھا"۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ لغت کے دائرے سے نکل کر تعریف و توصیف کا

مفہوم رکھنے والا ''نعت'' لفظ ایک ہی موضوع کیلئے مشخص اور متعین ہوگیا ہے۔ یعنی رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والا صفات اور سُنّتِ انسانیت آموز کی نشاندہی میں لانے کا موضوع۔ اگرچہ آسانی کیلئے ہم نعت کو ایک موضوعی صنف بھی کہہ سکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ نعت غزل، مثنوی، رُباعی، قصیدہ، مسدّس اور ترجیع بند غرض ہر صنفِ شاعری میں کہی جاسکتی ہے اور کہی گئی ہے۔ البتہ اس میں ذات وصفاتِ رسول اکرم صلعم کے ساتھ والہانہ عقیدت ومحبت کا جو بنیادی عنصر کامرانی وکامیابی کا راز گردانا گیا ہے وہی سوز وساز سے عبارت ہے۔ علی میاں اِسکی دوسری توجیہہ کے بارے میں لکھتے ہیں'' بعض لوگوں نے اس کی توجیہہ دُوری اور ہجر سے کی ہے۔ اس لئے محبت اور دِل کے سرچشموں اور سوتوں کو چھیڑنے، نئی نئی تعبیرات اور معانی کا سہارا لینے اور خوابیدہ صلاحیتوں اور مخفی قوتوں کو بروے کار لانے اور دبی ہوئی چنگاری کو شعلۂ جوالہ بنانے میں اِن دونوں چیزوں کا بڑا حصہ ہے۔ ان میں سے اکثر شعر جزیرۃ العرب اور مدینہ منورہ سے بہت دور تھے۔ نیز اُس عہد میں حجاز کا سفر اتنا آسان نہ تھا۔ انتشار اور بدامنی کا دور دورہ تھا اور حجاج کے قافلے اکثر وبیشتر غارت گری اور رہزنی کا شکار ہوجایا کرتے تھے۔ اُس پر خطر اور طویل سفر کی دشواریاں، موانع کی کثرت اور زیارت سے محرومی، یہ وہ باتیں تھیں جن کی تلافی وہ اِن شوقیہ اشعار سے کرنا چاہتے تھے۔ جن کو ہمیشہ دِل کا نامہ بر سمجھا گیا ہے''۔

برصغیر میں اقبال کے زمانے تک فارسی نعت گوئی کی روایت اور پیشرفت و مقبولیت کا راز جاننے کیلئے کئی باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے اول یہ کہ گزشتہ ایک ہزار سالہ عرصۂ تہذیب پروری کے دوران جو رنگین اور مِلی جُلی ثقافت یہاں پروان چڑھی اُس میں ثقافت پرور وزراء واُمراء سے زیادہ اہم رول فارسی دان اولیاء اللہ اور صُوفیا کا تھا اور اُن کی آئے دن کی محفلوں میں ذہنوں اور دِلوں کی تربیت کیلئے سب سے

دلنشین اور شرین موضوع سیرتِ رسولؐ اور جان نثاریٔ اصحابِ رسولؐ کا ذکرِ خیر ہی ہوا کرتا تھا یوں سوز و ساز کی پرورش میں نعت کا کلیدی رول مُسلّم تھا۔ دوسری بات یہ کہ ہندوستانی زبانوں میں تصنیفات و تالیفات کے شعور کو نئی بلندیوں سے آشنا کرنے میں جو رول فارسی شاعروں اور ادیبوں نے یہاں کئی صدیوں تک نبھایا ہے وہ رول خاص آداب کو ملحوظ رکھنے کا مُکلّف تھا۔ چنانچہ اُس کی رُو سے کسی بھی تصنیف و تالیف کو اچھی تصنیفات و تالیفات کی سطحِ مطلوب و مرغوب تک پہنچانے کیلئے وہ حُسنِ آغاز لازمی گردانا جاتا تھا جس میں ایک مُناجات کے بعد ایک یا ایک سے زیادہ نعتوں کا طومار باندھنا کتاب کی سعادتمندی اور مقبولیت کا ایک پیش خیمہ جانا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ روایت فارسی زبان کے جلیل القدر اساتذہ اور معماروں نے پنج گنج نظامی پنج گنج امیر خسروؒ پنج گنج مولانا جامی اور پنج گنج شیخ صرفی کشمیری میں بھی قائم رکھی ہے اور گلستان و بہارستان جیسے نثری شاہکاروں میں بھی بلکہ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے والے شعراء کے بیشتر دیوانوں میں بھی اس روایت کی پاسداری کا خیال رکھا گیا ہے۔ اقبال نے اسی قبیل کے اکثر سرکردہ اور رقیق القلب شاعروں کے اشعار پر تضمینیں لکھ کر اُن کے تئیں اپنی عقیدت مندی ظاہر کی ہے اسرارِ خودی اور بانگ درا سے لے کر جاوید نامہ اور ارمغان حجاز تک پھیلے ہوئے درجن بھر شعری مجموعوں میں اقبال جہاں عشقِ رسول کے آداب سکھانے والے مولانا رومیؒ مولانا جامی اور عرفی شیرازی کا ذِکر خاص والہانہ انداز سے کرتا ہے وہاں دوسرے بڑے اور چھوٹے نعت گو شعراء کے اشعار کا انتخاب بھی بغرض توثیق معانی عمل میں لاتا ہے۔ ایسے حضرات میں یہ سب شامل ہیں۔ عطارؔ، سنائیؔ، خاقانیؔ، رومیؔ، انوریؔ، سعدیؔ، ناصرؔ، نظیریؔ، صائبؔ، غنیؔ، کلیمؔ، قدسیؔ، بیدلؔ، غالبؔ، قاآنیؔ، عرشیؔ، عزتؔ بخاری، رضی دانش اور ملک قمی۔

جس طرح فارسی زبان کے ہزار سالہ اثر و نفوذ کی گہرائی اور گیرائی سمجھ کر ہم

بڑے وثوق سے یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر کی رنگین تہذیب اور ادبی میراث کے بارے میں قرونِ وسطیٰ سے لے کر ماضی قریب تک جس بھی موضوع پر تحقیق ہوگی وہ ہرگز معتبر نہ ہوگی اگر صاحبِ تحقیق اُن ماخذوں اور تذکروں تک براہِ راست رسائی حاصل کرنے سے محروم رہا ہو۔ جو فارسی میں لکھے گئے ہیں اور جو ادبیات کے علاوہ سیاسیات، سماجیات اور اقتصادیات کی آئینہ داری بھی کرتے ہیں۔ جس طرح ہم یہ بات بھی وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ فارسی زبان میں کامل دسترس حاصل کئے بغیر اقبال شناسوں کی صف میں بیٹھنا بھی ایک گونہ خود فریبی ہے۔ اسی طرح عقیدہ ساز اور تہذیب نواز نعت گوئی سے متعلق کوئی رائے اقبال کے حوالے سے معتبر نہیں قرار دی جاسکتی اگر اقبال کو شاعرِ مشرق بنانے میں قرآن در زبان پہلوی پیش کرنے والے مولانا رومیؔ دوسروں کو آدابِ عشق رسول ﷺ سکھا کر حسانِ عجم اور ثانیٔ امام بوصیری بن جانے والے مولانا جامیؔ، تقاضائے ایمان سمجھا کر ہمارے قلب ونظر کو معراج شناسی کا شہپرِ پرواز بخشنے والے نظامی گنجوی، جہاں گردی اختیار کر کے ہمارے شعور کو کندن بنانے والے شیخ سعدی اور اپنی بلند آہنگی خود شناسی اور بلند فکری سے ہمیں نعتیہ اظہار کی نئی راہِ سعادت دکھانے والے عرفی شیرازی کی حجازی لے سے ہم بیگانہ رہیں۔ یا اگر ہم اُن رموز کا عرفان حاصل کرنے سے محروم رہیں جن کی نشاندہی برصغیر کی سطح پر امیر خسرو نے

ع باخدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار، جیسے ناطق فرمان کی پذیرائی کر کے عمل میں لائی ہے اور جن کی زیرین لہر کو غالبؔ نے جلالِ خداوندی سے جمالِ محمدیؐ میں منتقل ہوتے دیکھ کر یہ زریں نکتہ اُبھارا تھا کہ

آئینہ دارِ پرتوِ مہر است ماہتاب آرے کلامِ حق بزبانِ محمدؐ است

اسی کیف وسرود اور سوز وساز کا پروردہ اقبال کا تخلیقی شعور جب نعت کی مقدس ومبارک سرزمین میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کر لیتا ہے تو اُس کے شب وروز کا

عالم یہ ہو جاتا ہے

گہے شعرِ عراقی را بخوانم گہے جامی زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگِ عرب را شریکِ نغمہ ہای ساربانم

اِسی درد و سوز کے تحت اقبال ایسے والہانہ تخاطب کی تحریک بھی پاتا ہے

با خدا با پردہ گویم با تو گویم آشکار یا رسول اللہؐ او پنہان و تو پیدای من

اِس دُنیائے درد و سوز اور کیف و سرور میں پہنچ کر اقبال ''وما ارسلناک الا رحمة للعالمین'' جیسے ارشادِ ربانی کا پیکرِ نور چشمِ دل سے دیکھنے کی سعادت حاصل کر لیتا ہے اور لولاک لما خلقة الافلاک جیسی حدیث قدسی کی صداقت اُس کو بڑے جتن سے حاصل کردہ فلسفہ سے یکسر بیزار بنا دیتی ہے چنانچہ نوبت یہ کہنے پر پہنچ جاتی ہے کہ

مرا از منطق آید بوے خامی دلیلِ او دلیلِ ناتمامی
برویم بستہ درہا راگشاید دوبیت از پیرِ رومی یازِ جامی

نعت گوئی میں پیرِ رومی کا نعتیہ اظہار اقبال کی خود اعتمادی کو تقویت بہم پہنچاتا ہے مثلاً ایسے اشعار سے:

مارمیت اِذ رمیت احمد بُدہ است دیدنِ او دیدنِ خالق شُدہ است
مِدحتِ او مدحت و تسبیحِ حق! میوہ مے روید زِعین این طبق
دُومگوی و دُو مدان و دُو مخوان بندہ را در خواجہٗ خود محو دان
چون جُدا بینی زحق این خواجہ را گم کُنی ہم متن و ہم دیباچہ را

چنانچہ اقبال کے جملہ کلام پر بحیثیتِ مجموعی اسی نعتیہ اظہار کا رنگ غالب آنے لگتا ہے یوں انسانِ کامل کی مکمل پیروی کرنے والا مومن اب شاعر کو جن اِمکانات سے ہمکنار ہوتا دکھائی دیتا ہے وہ یہ ہیں:

غالب و کار آفرین، کار کشا، کارساز ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن

بلکہ سورۂ فتح کے آخری رکوع میں شامل هُوَ الَّذِی اَرسَلَ جیسے ربانی نعت کی روشنی میں جب اصحاب رسولؐ کی پیروی کرنے والوں کے قد کا اندازہ بھی شاعر کو بخوبی ہو جاتا ہے تو وَالَّذین معہٗ اشداء علی الکفار و رحماء بینهُم کا عرفان اور مومنانہ شان کا شعور ایسے اشعار کا رُوپ دھار لیتا ہے

شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا مصافِ زندگی میں صورت فولاد پیدا کر
دریاؤں کے دِل جس سے دہل جائیں وہ طوفان جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے راز دانوں میں نہ ہو نومید نومیدی زوالِ علم و عرفان ہے
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اُس پر حرام مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ

نعتیہ درد و سوز کے رنگ میں رنگ جانے کے بعد اقبال کا تخلیقی شعور نہ صرف ہر قدم پر تعلیماتِ قرآن کو ملحوظ رکھنے کا مکلّف بن جاتا ہے بلکہ اب وہ رسولِ محترمؐ کے دربار میں دل و نظر کھول کر حاضر ہوتا ہے اور ایک وفادار غلام کی حیثیت سے یہ حلف دُہرانے لگتا ہے کہ اگر میرا دل آپ کی محبت کے جوہر سے خالی ہو کر یا قرآنی تعلیمات سے غافل ہو کر ایک بھی شعر تخلیق کرتا ہو تو میری وہ عمر بھی کی آرزو پوری نہ ہونے دیجیۓ گا جو میں نے آپ کے وہ پائے نازنین اپنی آنکھوں سے چومنے کی صورت میں پال رکھی ہے جن کو تمام انسانوں کی بھلائی چاہتے ہوئے بازارِ طائف میں لہولہان ہونا پڑا تھا۔ اقبال کے نعتیہ اشعار اِس حلفیہ بیان کو یوں پیش کرتے ہیں۔

اے فروغت صبحِ اعصار و دہُور چشمِ تو بینندۂ مافی الصدور
گر دلم آئینۂ بے جوہر است ور بحر فم غیرِ قرآن مُضمر است
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پاکن مرا

آدابِ عشقِ رسولؐ سکھانے میں اقبال کو رومی اس لئے بھی لاثانی لگتے تھے کہ نغمۂ رومی سے بے نیاز اور بے خبر رہنے والے مومن کی خودی کا ساز مطلوبہ کام کر ہی نہیں سکتا

گسستہ تار ہے تیری خودی کا تاراب تک کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز اب

دراصل نغمۂ رومی وہ نغمۂ عشق ہے جو ہمیں اپنی شناخت اور تشخص تک پہنچاتا ہے۔ محرمِ عشقِ رسولؐ ہونے کی اسی فضیلت کے حوالے سے رومی کا سراپا اقبال کو سرورِ سرمدی اور نورِ محمدیؐ کا آئینہ دکھائی دیتا ہے۔

پیکرش روشن زنورِ سرمدی درسرا پایش سرورِ سرمدی
برلب اوسر پنہانِ وجود بندہای حرف و صوت از خود گشود

اقبال مثنویٔ رومی کی بحر کو اپنی شاہکار مثنویوں کیلئے اس لئے بھی منتخب کر لیتے ہیں کہ وہ اقبال کی اولین درسگاہ عشق ہے۔ یہ سبق اقبال نے اسی درسگاہ میں پڑھا تھا۔

شاد باش اے عشق خوش سوادیِ ما اے طبیبِ جملہ عِلّت ہایِ ما
اے دوایِ نخوت و ناموس ما اے تو افلاطون و جالینوسِ ما
عشق آن شعلہ است کو چون برفروخت آنچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

اقبال کو آدابِ نعت رسول ﷺ سکھانے والے ممتاز فارسی شاعروں میں سے رومی کے علاوہ نظامی گنجوی، خاقانی، شیخ سعدی، امیر خسرو، مولانا جامی، عرفی شیرازی اور مرزا غالب کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ البتہ آخری عظیم صوفی شاعر ہونے کے ناطے خاتم الشعراء کہلانے والے مولانا جامی کی روح پرور نعت گوئی میں اقبال کیلئے رازدارانہ اور والہانہ مکالمے بھی کشش کا باعث ہیں جامی کے زیرِ اثر اقبال کو شدت سے اِس حقیقت کا اِدراک حاصل ہو گیا تھا کہ اِنسان کو رُوحانی سکون پانے کیلئے اور شخصیت کی ہمہ گیر نشوونما کو یقینی بنانے کیلئے فکری سطح پر حصولِ علم و حکمت اور کمالِ عرفان و آگہی

کے علاوہ عملی سطح پر بھی کمالِ عشق واِتباع ویسا ہی حاصل ہونا ایک لازمی شرط کا درجہ رکھتا ہے جو نفسِ بایزید بسطامی کو شدتِ اشتہا کے باوجود سامنے پڑا ہوا خربوزہ کھانے سے محض اس لئے روک رکھتا ہے کہ موصوف کو رسول محترمؐ کے ہاں خربوزہ کاٹنے کا طریقہ ابھی دریافت نہ ہو سکا تھا۔ اقبال کو جامی کے ہاں ہی یہ عرفان حاصل ہو جاتا ہے کہ

دہد حق عشقِ احمدؐ بندہ گانِ چیدۂ خودرا　　بہ خاصان شاہ مے بخشد مئے نوشیدۂ خودرا

جامی کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ وہ بڑی سخاوت اور مہارت سے کام لے کر حاصل شدہ بادۂ عرفان میں دوسروں کو شریک کر لیتے ہیں مثلاً ایسے نعتیہ اشعار کی جانب دعوتِ فکر دے کر نمبر ۱

جہان روشن است از جمالِ محمدؐ　　اِرم تازہ گشت از وصالِ محمدؐ
خُوشا مجلس و مسجد و خانقاہے　　کہ دروے بود قیل وقالِ محمدؐ

نمبر ۲

عارض است این یا قمر یا لالۂ حمر است این　　یا شعاعِ شمس یا آئینۂ دِلہا ست این

نمبر ۳

وصلی اللہ علیٰ نورٍ کز و شدُ نورہا پیدا　　زمین از حُبِ او ساکن فلک از عشقِ او شیدا
زِ سرِ سینہ اش جامی الم نشرح لک برخوان　　زمعراجش چہ میجوئی کہ سبحان الذی اسریٰ

نمبر ۴

سودایِ بہشت از سرِ دانا برود لیک　　ممکن نہ بود رفتنِ سودایِ مدینہ
ہر گز بہ تماشایِ بہشتت نکشد دل　　گر چشم گُشایی بہ تماشای مدینہ
ہر چند کہ در خاکِ خراسان شدہ محبوس　　جامی ز دل است عاشقِ شیدایِ مدینہ!

جہانِ روشن، اِرمِ تازہ، رُخِ وَالضحیٰ اور زُلفِ واللیل جیسے نادر بصری پیکروں کو بروے کار لا کر جس طرح مولانا جامی نے معاملاتِ قلب ونظر کے حوالے سے نورانی

کیفیات اور آسمانی الہامات کو دیدنی بنایا ہے وہ انکی جادو نگار زباندانی کا ہی حصہ ہوسکتا تھا۔ حُسنِ تخاطب اور شیرین زبانی کے علاوہ مولانا جامؔی کی جس ادا نے اقبال کو خصوصاً متاثر کیا تھا وہ نعتیہ درد و سوز کی ایسی کیفیت تھی جو آقائے نامدارؐ کے ساتھ اندازِ ہمکلامی سکھانے کے ایک شعارِ خاص کی محرک تھی اور جو مراسلہ کو مکالمہ بنانے کے انداز میں نعت گوئی کو کمالِ غزل گوئی کے مقام تک پہنچانے کی ضامن تھی۔ اُس اداے خاص کے چند پہلو یہ ہیں

۱

تو جانِ پاکی سر بسر نے آب و خاک اے نازنین — واللہ جان ہم پاک تر روحی فداک اے نازنین
جامی کہ دارد با تو خو ہرگز نتابد از تو رُو — گر خود نہی بر فرقِ او تیغِ ہلاک اے نازنین

۲

والضحیٰ لمعۂ خدت دیدم — قُمْ فانذر سہی قدت دیدم
عرش و کرسی و آسمان و زمین — ہمہ زوّارِ مرقدت دیدم
جامی از شوق ہر نفس گویا — یا محمدؐ محمدت دیدم

۳

اے دل و دیدہ ہر دوخانۂ تو — سرِمنِ خاکِ آستانۂ تو
ہمہ تن گوش مے شوم از عشق — ہر کجامے رود فسانۂ تو
جامیؔا بوے درد مے آید — از غزل ہاے عاشقانۂ تو

۴

خدایا بہ آن سروِنازم رسان — بہ آن دلبرِ دلنوازم رسان
چو جامؔی زبیچارگی سوختم — بدیدارِ آن چارہ سازم رسان

۵

ہر کس کہ بیند آن لعل خندان انگشت حیرت گیرد بدندان
جامؔی پسندد صدرنج باخود جزرنجِ صحبت باخود پسندان

اشکِ ندامت کو رشکِ گوہرِ آبدار بنانے والا یہی وہ پس منظر تھا جو تخلیقی سفر کے آغاز سے ہی فکرِ اقبال پر جامؔی کا نقش ثبت کرتا رہا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ درجِ ذیل اشعار کو اپنی سب سے اولین اور معرکۃ الآرا تصنیف اسرارِ خودی میں خاص اہتمام سے شاملِ متن کرنے کا ارادہ ابھی مکمل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اقبال نے انہیں بطور تضمین اپنے دوست ملا واحدی کے ہاں خاص روح پرور تحفہ بنا کر بھیج دیا تھا۔ اِس عبارت کیساتھ:

''ڈیئر واحدی صاحب۔ مولانا جامؔی کے ایک شعر کی تضمین عرض ہے۔ جو فارسی مثنوی کا ایک جزُو ہے۔ عنقریب یہ مثنوی بھی انشاء اللہ تعالیٰ شایع ہوگی

گشتۂ اندازِ مُلا جامیم نظم و نثر او علاجِ خامیم
شعر لبریزِ معانی گفتہ است درثنائے خواجہؐ گو ہرسُفتہ است

''نسخۂ کونین را دیباجہ اوست
جُملہ عالم بندگان و خواجہ اوست''

یہاں اقبال نے دوٹوک الفاظ میں یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ دِل و جان سے مولانا جامؔی کے فکر و فن پر شیدا ہیں اور اُن کی نظم و نثر کو اپنی خامیوں کا علاج سمجھتے ہیں۔ اقبال کو عرفانِ منظوم اور صوفیانہ شاعری کے نام پر پھیلائی گئی اُس منفی سوچ کا علاج بھی بلند بانگ عرفیؔ کی شاعری میں نظر آیا ہے جو سوچ حافظ شیرازی جیسے مقتدر صوفی شعراء کی رنگین اور مقبول شاعری نے اکثر مسلمانوں کے ذہنوں میں پیدا کر رکھی تھی۔ اقبال لسانُ الغیب حافظ کے خلاف عَلمِ احتجاج بلند کرنے کے بعد عالمگیر مقبولیت والا دیوانِ حافظ

عرفی کی حِس ایک ہی نعت پر قربان کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں ، نبیؐ شناسی میں ممتاز اُس بلند آہنگ نعت کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے

اقبالِ کرم مے گزد اربابِ ہمم را — ہمت نہ خورد نیشترِ لا و نعم را
بی برگئی من داغ نہد بر دِل سامان — بے مہریٔ من زرد کند روئ دِرم را
عرفی مشتاب این رہِ نعت است نہ صحرا — آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم را
دانم نرسد ذرہ بہ خورشید ولیکن — شوقِ طیران مے کشد اربابِ ہمم را
ہرگاہ کہ درمدح بلغزم توبخشای — کز مدح ندانم منِ حیرت زدہ ذم را
دانش نگشاید بسزا عقدۂ نعتت — زین جاست کہ اندیشہ نگون کرد علم را

اگرچہ عرفیؔ اور جامیؔ سے بہت پہلے نظامیؔ اور امیر خسروؔ نے بھی شیخ سعدی کی طرح آقائے نامدار صلعم کے ساتھ ہم کلام ہونے کے آداب سکھانے میں اُستادانہ رول ادا کیا ہے پھر بھی فکری طور پر زیادہ مناسبت قلبی نہ بننے کے سبب فلسفی شاعر اقبال اُن کے نعتیہ اسلوب کے ساتھ ایسی والہانہ عقیدت پیش کرنے پر آمادہ نہ ہو سکے ہیں۔ حالانکہ نظامی کا نعتیہ امتیاز بھی مسلم ہے خصوصاً معراج کے لاجواب منظر نامے تشکیل دینے کی سعادتمندی میں نظامی کا کوئی جواب نہیں اور امیر خسرو بھی عاشقانہ بے تکلفی سے کام لے کر نعت اور غزل کے درمیان حد فاصل مٹانے کی وارفتگی میں لاجواب ہیں۔ ہم یہاں پر اقبال کے نعتیہ اظہار کی مناسبت سے ان دونوں کے کلام سے متعارفانہ قسم کی صرف دو اور تین مثالیں بالترتیب پیش کرنے پر اکتفا کریں گے پہلے نظامی کی عظمتِ اسلوب کا اندازہ لگایئے

۱۔

محمدؐ کہ بے دعویٔ تخت و تاج — زِشاہان بشمشیر بستدُ خراج
غلط گفتم آن شاہِ سِدرہ سریر — کہ ہم تاجور بود و ہم تخت گیر

تنش محرمِ تختِ افلاک بُود　　سرش صاحبِ تاجِ لولاک بود
اگر خضر بر آبِ حیوان گذشت　　محمدؐ ز سر چشمۂ جان گذشت
سلیمان اگر تخت برباد بست　　محمدؐ زِ بازیچۂ باد رَست

۲۔

زمین خاک شدبوی طیبش توئی　　جہاں درد زَد شدطبیبش توئی
توئی چشم روشن کُنِ خاکیاں　　نوازندۂ جانِ افلاکیاں
طرازِ سخن سکۂ نام تست　　بقایِ ابد جرعۂ جامِ تُست

اب طوطئ ہند امیر خسرو کے اندازِ بیان کی یاد تازہ کیجئے

محمدؐ شہِ لاجودی سریر　　کزوگشت ہستی عمارت پذیر
زباغِ رخش ہست بستان گُلے　　دران باغ روح الامین بلبلے
ہمہ لوحِ محفوظ درشانِ او　　سیاہ و سپیدِ جہان زانِ او

(ب) بے تکلفیٔ امیر خسرو کی وہ صورت جو نعت شناس اقبال کے ذوق سلیم کو بالکل راست نہ آسکی ہے یہ ہے۔

نمے دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم　　بہر سو رقصِ بسمل بود شب جائیکہ من بودم
پری پیکر نگارے سروقدے لالہ رخسارے　　سراپا آفتِ دل بود شب جائیکہ من بودم
خدا خود میرِ مجلس بود اندر لامکان خسرو　　محمدؐ شمع محفل بود شب جائیکہ من بودم

۳۔

اے چہرۂ زیبای تو رشکِ بُتانِ آذری　　ہرچند وصفت مے کنم درحُسن زان زیباتری
آفاق را گردیدہ ام مہرِ بتان ورزیدہ ام　　بسیار خوبان دیدہ ام اما تو چیزے دیگری
من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی　　تا کس نگوید بعد ازین من دیگرم تو دیگری

اس اظہارِ بے تکلفانہ سے بچ کر نعت گوئی میں احتیاط پسند اقبال کو جونسی روش

بہت لبھائی ہے وہ عزت بخاریؔ جیسے نسبتاً کم معرف شاعر کی یہ ادب آموز اور بصیرت افروز روش ہے:

ادب گاہیست زیرِ آسمان از عرش نازک تر
نفس گُم کردہ مے آید جُنید و بایزید اینجا

چنانچہ اسی شعر کو شاعرِ مشرق نے اپنی آخری مایہ ناز تصنیف ارمغانِ حجاز کے خاص الخاص حصہ یعنی ''حضورِ رسالت'' حصہ کیلئے ماتھے کا جھومر بنایا ہے۔ آنحضورؐ سے تخاطب کی جسارت کرتے وقت نبی شناس اقبال کا اظہار بلند آہنگ عرفیؔ کی طرح اِنتہائی پست اور عاجزانہ ہو جاتا ہے مثلاً

خواجۂ من نِگاہ دار آبروئِ گدای خویش
آنکہ ز جوی دیگران پر نہ کند پیالہ را (زبورِ عجم)

حضورؐ دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی (بانگ درا)

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب (بال جبریل)

اے ظہور تو شبابِ زندگی
جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی (رموز بیخودی)

یہ بات مزید توجہ سے ذہن نشین کرنے کے لائق ہے کہ اقبال کا فکرِ وفن عرفانِ رسالت کے معاملے میں اور شعورِ ممونیت کے معاملے میں بہت ہی سر بلند ہے۔ اسی بناء پر اقبال کا نعتیہ رویہ کئی عظیم پیشرو نعت گو حضرات سے زیادہ والہانہ اور زیادہ بالیدہ ہونے کے علاوہ زیادہ محتاط بھی ہے جب ہی تو وہ کبھی لسان الغیب حافظ شیرازی کے مقابلے میں عرفی شیرازی کی رسول شناسی کو زیادہ صحت مند قرار دیتے ہیں

اور کبھی ہم عصر جید عالمِ دین مولانا حسین احمد مدنی کے نظریۂ وطن کی اصلاح چاہتے ہوئے ان سے یوں مخاطب ہوتے ہیں:۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

رسول شناسی اور نعت کی آداب شناسی سے متعلق اقبال کے واضح شعور کا پرتو انکی اولین مثنویوں میں بھی کھل کر سامنے آگیا ہے ان کے مطالعے سے ہمیں ایک طرف اس بات کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ فنی اعتبار سے اصنافِ سخن میں شمار ہونے کے باوجود صنفِ نعت کسی ہیئت کا نام نہیں البتہ نعت بحیثیت موضوع تمام شعری اصناف پر محیط ہے مثلاً نعت صنفِ مثنوی، صنفِ غزل، صنفِ رباعی اور دیگر تمام صنفوں میں کہی جا سکتی ہے جیسا کہ خود اقبال کے ہاں بھی موضوعِ نعت پر ان ہیئتوں کے تجربے ملتے ہیں البتہ ہر موضوع کی طرح نعت پر مبسوط اظہار اور منظوم بیانیہ کیلئے جتنی مناسب اور کارآمد صنفِ مثنوی واقع ہوگئی ہے اتنی مفید کوئی اور صنف نہیں لگتی۔ خصوصاً جب نعت موضوع کے تحت رسالت اور سیرت کا نورِ بصیرت عام کرنا مطلوب ہو جیسے کہ اقبال کو ترجیحاً مطلوب رہا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی ابتدائی مثنویوں یعنی اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کے چند نعتیہ اشعار کو اُردو ترجمے کے ساتھ پیش کرنے پر ہی اس مقالے کو ختم کیا جائے۔ وہ بھی ایسے اشعار چن کر جن سے آنحضورؐ کی دِل نواز صورت و سیرت اور شاعر کی دل گداز ندایہ و غیر ندایہ نعتوں کی مختصر نمائندگی بھی ہو جائے۔ ملاحظہ فرمایئے ان سب عناصر سے مملو فکرِ اقبال کے عکاس یہ چند شعر

دردِل مسلم مقامِ مصطفیٰؐ ست = ہر صاحبِ اسلام فرد کے دل میں آقای نامدار حضرت محمد مصطفیٰؐ کی ذاتِ بابرکت کو خاص مقام حاصل ہے۔

آبروئے ما زِ نام مصطفیٰؐ ست = واقعاً آپؐ کے اسم گرامی کی بدولت ہی ہمیں

آبرومندی نصیب ہوئی ہے۔

بوریا ممنون خوابِ راحتش = یہ وہی عظیم ترین شخصیت ہے جس نے موٹے اور نرم بستر پر نہیں بلکہ ٹاٹ پر سونا گوارا فرمایا

تاجِ کسریٰ زیرِ پایِ اُمتش = ہاں وہی عظیم الشان شخصیت جن کی اُمت نے شہنشاہِ ایران جیسے مطلق العنان لوگوں کے تاج اپنے قدموں تلے روند لئے۔

درشبستانِ حرا خلوت گزید = آپ نے انسانیت کے غم میں غارِ حرا کے فرشِ خاک پر کتنی راتیں تنہائی میں روتے ہوئے گذاری ہیں

قوم و آئین و حکومت آخرید = تب جا کر ایک انسانیت نواز قوم، ایک انسانیت نواز آئین اور ایک انسانیت نواز طرزِ حکومت وجود میں آسکا ہے۔

وقتِ ہیجا تیغ او آہن گداز = سچ کے بچاؤ اور جھوٹ کے جھکاؤ کیلئے لڑی جانے والی جنگ کے وقت آپکی شمشیرِ آبدار فولاد کو بھی پگھلا دیتی تھی۔

دیدۂ او اشکبار اندر نماز = البتہ انسانوں کے اُسی عظیم ترین غمخوار کی مبارک آنکھیں نماز میں ہمیشہ اشکبار رہتی تھیں۔

از کلید دین درِ دنیا کشاد = یہ اسی انسانِ کامل، محسنِ اعظمؐ کا تذکرہ ہو رہا ہے جس کے دستِ مبارک نے دین کی چابی سے مسائلِ دُنیا کے ہر دروازہ کو کھولنے کا راز بتا دیا ہے۔

ہمچو او بطنِ اُمِ گیتی نزاد = یہ بات عالمی سطح پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ مادرِ گیتی نے اِن جیسا کوئی اور بیٹا نہیں جنا ہے۔

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید = اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیکرِ واحد کی حیثیت سے ہی خیر الامت بن سکنے کے امکاناتِ خاص بخش کر پیدا کیا ہے۔

وز رسالت در تنِ ما جان دمید = اور ہمارے مسلکی جسموں میں نسبتِ

رسالت کی یعنی آنحضورؐ سے منسوب ہونے کی مشترکہ روح پھونک رکھی ہے۔

از رسالت در جہان تکوینِ ما= دنیا میں ہمارا ملی وجود اُلفتِ رسالت کی مشترکہ قدر کی بدولت ہی قائم رہ سکتا ہے۔

از رسالت دینِ ما' آئینِ ما= بلکہ اُلفتِ رسالت اور اتباعِ رسالت پر ہی ہمارا دین اور آئین قائم رہ سکنے کا دارومدار ہے۔

از رسالت صد ہزارِ ما یک است= رسالت کے تصور سے ہی الگ الگ انفرادی وجود رکھنے کے باوصف ہمارا ایک اجتماعی وجود ممکن بن گیا ہے۔

جُزوِ ما از جُزو مالاینفک است= اسی دولت مشترکہ کی بدولت احیاء وبقاء سے متعلق ہمارے سارے مفادات اٹوٹ طور پر ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے ہیں۔

آنکہ شان اوست یھدی من یرید= جنکی شان میں اللہ نے یھدی من یرید کہہ کر دراصل اپنے حبیبؐ کے دل کا بوجھ ہلکا کیا ہے۔

از رسالت حلقہ گردِ ما کشید= اسی لاثانی شان والے ختم الرُّسلؐ کی رسالت نے ہمارے گرد آخری اور حتمی شرع کا دائرہ کھینچ رکھا ہے۔

اے زمین از بارگاہت ارجمند= اے میرے پیارے آقا سیارۂ زمین کو آپکی بارگاہ کیا ملی کہ اسکی قدر ومنزلت سارے سیاروں سے بڑھ گئی ہے۔

آسمان از بوسۂ بامت بلند= آسمان کو آپکے روضۂ پاک کا بام چومنے کی بدولت ہی یہ بلندی ہاتھ آگئی ہے۔

در جہان شمعِ حیات افروختی= آپ نے دُنیا میں تشریف لاکر کبھی نہ بجھنے والی ایسی شمعِ ہدایت جلائی ہے جو ہر ایک کیلئے حیات بخش ہے۔

بندگان را خواجگی آموختی= آپ ہی وہ امّی لقب اُستادِ معرفت اور معمارِ کردار ہیں جن کی بدولت خاک بسر غلام بہترین آدابِ حکومت کے ماہر بن سکے ہیں۔

اے بصیری را ردا بخشندہ ئ = اے سخیوں کے سخی شعر شناس اور شاعر نواز آقاؐ آپ نے عمدہ نعت گوئی والے بوصیری کو رِدا بخش کر امام بصیری بنا دیا ہے۔

بر ربطِ سلما مرا بخشندہ ئ = ویسی ہی سخاوت بروے کار لا کر مجھ میں فکر بلند والی شاعری کا ذوق وشوق نکھارنے والے بھی آپؐ ہی ہیں۔

ذوقِ حق دہ این خطا اندیش را = اب آپؐ ہی مجھے حق وصداقت کی آبیاری کا ذوقِ سلیم بھی عطا فرمایئے گا۔

اینکہ نشنا سد متاعِ خویش را = تا کہ میں اُس غفلت سے نکل سکوں جس نے مجھے تحفظِ ناموس جیسے گراں بہا تہذیبی سرمائے کی پہچان سے اندھا بنا رکھا ہے۔

گر دِلم آئینہ ی بے جوہرست = آقائے محترمؐ اگر میں نے اپنے دِل کا آئینہ آپ کی محبت کے جوہر سے کبھی بھی خالی رکھا ہو

ور بحرفم غیر قرآن مضمراست = اور اگر میں نے حکمتِ قرآن کے بغیر کسی اور فکر کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہو

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن = تو آپؐ بلا درنگ میری سوچ کو ملی ہوئی عزت و ناموس کا پردہ تار تار کر لیجئے گا۔

این خیابان راز خارم پاک کن = اور اپنی امت کے باغ سے کانٹے کی طرح مجھے باہر پھینک دیجئے گا۔

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا = آپکے احسانات کے ذکرِ خیر کو بھولنے کی سزا اِس دنیا میں خوار ہونے کو ہی کافی نہ سمجھوں گا۔ اگر مجھ سے واقعاً

بے نصیب از بوسہ پا کن مرا = ایسی بھُول سرزد ہوئی ہو تب مجھے محشر میں بھی خوار و رسوا کیجئے گا اور عمر بھر اپنے دل میں پالی ہوئی اس آرزو کے پورا ہونے سے محروم کر دیجئے گا جو آپ کے پاؤں چومنے کیلئے وقف ہے۔

گر دُرِ اسرارِ قرآن سُفتہ ام با مسلمانان اگر حق گُفتہ ام

البتہ میرے آقا اگر میں نے اپنی پُوری شاعری میں قرآن حکیم کے موتیوں کو پرونے کی کوشش کی ہے اور اگر میں نے پوری لگن سے اور

درعمل پایندہ تر گردان مرا

صدق دِلی سے مسلمانوں تک سچ بات پہنچانے کے لیے اپنے فکر وفن کو وقف رکھا ہے۔ تب اے امت پرور شفیق آقاؐ مجھے اس عمل پر ہمیشہ کار بند رہ سکنے کی جُرأت اور قُوت سے ضرور نوازیئے گا۔

آبِ نیسانم گہر گردان مرا

تب آپ کا یہ ادنیٰ غلام فکری اعتبار سے ابرِ نیسان کا ایک ایسا محتاج توجہ قطرہ ہے جس کو آپ کی خاص عنایت سے گوہرِ آبدار بننا ضرور نصیب ہو جانا چاہیئے۔

اقبال اور مولانا رومیؒ

تو بھی ہے اُسی قافلۂ شوق میں اقبالؔ
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومیؔ

اقبال نے دنیا کے بہت سے بلند پایہ فلسفیوں اور دانشوروں کے فکر و فلسفہ پر اظہارِ خیال کیا ہے اور اُن کی باتوں پر اپنے ردوقبول سے قارئین کو آگاہ کیا ہے۔ لیکن فارسی زبان کے جن عظیم شاعروں سے اکتسابِ فیض کرنے کا دوٹوک اعلان شاعرِ مشرق نے اپنی تصنیفوں میں ایک سے زیادہ بار کیا ہے اُن میں مولانا جلال الدین بلخی المعروف مولانا رومی کا نام سرِفہرست ہے۔ اقبال نے تین دہائیوں پر محیط اپنے تخلیقی سفر کے ہر سنگِ میل کیساتھ مولانا رومی کی رہبرانہ کرم فرمائی کا اعتراف آویزان کر رکھا ہے۔ اقبال کی سب سے روشن اُردو تصنیف بالِ جبریل ہے۔ اُس عالمگیر شہرت اور پذیرائی والی کتاب میں جہاں اقبال نے بہت بڑے سوالوں کا جواب مولانا رومی کی مثنوی معنوی سے بہم ہو جانے کا ایک گوشوارہ ''پیر رومی اور مرید ہندی'' کے مابین وقوع پذیر ہو گئے ہوئے روحانی مکالمے کی صورت میں پیش کیا ہے وہاں تہذیبِ مغرب کی چکاچوند روشنی کو فریبِ نظر قرار دے کر ''یورپ سے ایک خط'' عنوان کے تحت وہ نظم بھی اپنے ایک محرمِ راز دوست کو تحفتاً بھیجی ہے جس کے درمیان میں درجِ بالا شعر کو جگہ دی گئی ہے۔ اِس شعر کا ماقبل شعر یہ ہے

ہم خوگرِ محسوس ہیں ساحل کے خریدار
اِک بحرِ پُرآشوب و پُراسرار ہے رومیؔ

اور مابعد شعر یا تین شعروں پر مشتمل اس نظم نما خط میں آخری شعر یہ ہے

اس عصر کو بھی اس نے دیا ہے کوئی پیغام
کہتے ہیں چراغِ رہِ احرار ہے رومی

والہانہ عقیدت پر مبنی اِس چھوٹی سی نظم میں اقبال نے اپنی عقید تمندی کا جواز واضح کرنے کیلئے چار خاص ترکیبیں وضع کی ہیں اول یہ کہنے کیلئے کہ دبستانِ مشرق میں رجائیت اور حقانیت کی ترجمانی کرنے والے شاعروں کا ایک روشن دِل قافلہ الگ سے رواں دواں رہا ہے اور اُس کا روان کے حصے میں آیا ہوا خاص قافلہ سالار مولانا رومی ہے۔ دویم یہ کہ تبحّرِ علم کے اعتبار سے ملّی دردوسوز کے مدّ وجزر والے رومی کا تشخص ایک بحرِ پرآشوب کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ سویم یہ کہ تفکّرِ بلند اور کردار سازی کے معاملے میں رومی ایک پراسرار بحرِ ذخار ہے۔ چہارم یہ کہ سرکردہ صوفی شعراء میں شامل ہونے کے باوجود مولانا رومی اقبال جیسے تصوف کے منفی رجحانات کی شکایت کرنے والے دانشوروں کیلئے بھی ایک مشعلِ نور ہیں اور اُن کے کلام کی معنویت نئے چیلنجوں سے دُچار افراد کیلئے ایک مشعلِ راہ کی حیثیت سے اِس دور میں بھی برابر قائم ہے۔ رومی مشرقی شعراء کے کس خاص قافلۂ شوق یا کس قبیلۂ عشق سے تعلق رکھتے تھے؟ اُسکی نشاندہی کمالِ عجز و اِنکساری کیساتھ مولانا رومی نے خود یوں فرمائی ہے

عطّار روح بود و سنائی دوچشمِ او
ما از پئے سنائی و عطّار آمدیم!

ظاہر ہے کہ یہ تین نام ایران میں عرفانی شاعری کے تین بلندترین میناروں کے طور پر تاریخِ ادبیات فارسی میں درج ہیں۔ سنائی، عطّار اور رومی ایران میں اسلامی تصوف کے تین بڑے ترجمانوں کی حیثیت سے مِلّی شعور کی مشاطہ گری میں اور دردوسوز سے معمور شاعری کو آدم گری کیلئے وقف کرنے میں ایک ہی راہِ احسان وسلوک سے وابستہ رہے ہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ جو عقیدت اقبال نے رومی کے تئیں

دکھائی ہے وہی عقیدت مولانا رومی اپنے ہم قافلہ پیشرووں کے تئیں دکھا چکے تھے۔ چنانچہ حکیم سنائی غزنوی کے پختہ عرفان کے مقابلے میں اپنے آپ کو خام اور کچا جتلا کر نہ صرف یہ کہا ہے کہ

ترکِ جوشی کردہ ام من نیم خام   از حکیمِ غزنوی بشنو تمام

بلکہ عطار کو عشق حقیقی کے سات شہروں اور ہفت خوان کا محرمِ راز جتلا کر اپنے آپ کو ابھی ایک ہی شہر میں کوچہ گرد قرار دیتے ہوئے کہا ہے۔

ہفت شہرِ عشق را عطار گشت   ما ہنوز اندر خمِ یک کوچہ ایم

سوز اور دردمندی کو خاص موضوعِ سخن بنانے والے ان تینوں عظیم شاعروں نے عقل پر عشق کو ترجیح دینے کا شعار اپنایا ہے۔ دردِ دل میں تنزُّل واقع ہونے کو حکیم سنائی نے مسلمانوں کے اجتماعی زوال کا بنیادی سبب قرار دیا ہے کہا ہے

فروشد آفتابِ دین برآمد روز بے دینان   کجا شد دردِ بودرداؓ وآن اسلامِ سلمانیؓ؟

عطاؔر نے بھی دردمندی اور ایثار کے جذبے کو روحِ دین قرار دے کر نہ صرف رسمی اسلام سے اپنے کو الگ رکھنے کا اعلان کیا ہے بلکہ دردمندی سے عاری مسلمانوں کے ننگِ اسلام ہونے کا بلیغ اعلان بھی کیا ہے یوں

کُفر کافر را و دین دیندار را   ذرہٗ دردے دلِ عطار را

مولانا علی میاں نے ''روائع اقبال'' میں ان سب کے مدِ مقابل اقبال کے قد کا تعین یوں کیا ہے ''میں سمجھا ہوں کہ حکیم سنائیؔ، عطاؔر اور عارف رومی آدابِ شریعت کے پاس ولحاظ اور ظاہر و باطن کی یکرنگی اور دعوت و عمل کی ہم آہنگی میں اقبال سے بہت آگے ہیں۔ اقبال کے یہاں اسلامی عقیدہ و فلسفہ کی ایسی بھی تعبیریں ملتی ہیں جن سے اتفاق کرنا مشکل ہے''۔

دراصل اِس خاص شاعر قبیلے کا سب سے سربرآوردہ نمائندہ مولانا رومی ہے۔

جس میں اقبال کا مرشد بننے کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عمیق تر فہم دین کی بدولت سراپا درد وسوز ہے اور اپنے درد وسوز سے اقبال جیسے مریدوں کی خاک کو اکسیر بنانے کی کرامت رکھتا ہے یہ بیان اقبال کے اُن الفاظ میں دیکھئے جن کو اپنی معرکۃ الآرا تصنیف اسرارِ خودی کا دیباچہ بنایا گیا ہے یوں:

باز بر خوانم زِ فیض پیرروم دفترِ سر بستہ اسرارِ علوم
جان او از شعلہ ہا سرمایہ دار من فروغِ یک نفس مثل شرار
شمعِ سوزان تافت بر پروانہ ام بادہ شبخون ریخت بر پیمانہ ام
پیرِ رومی خاک را اکسیر کرد از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

اقبال کی شاعری میں بصری پیکروں کی بہتات اور درد وسوز سے وابستہ لفظیات کی تکرار موصوف پر مولانا کے گہرے اثر کا ہی نتیجہ ہے۔ مولانا کے اِس شعر سے فارسی ادب کا کون سا طالب علم واقف نہ ہوگا۔

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست خام بدم ' پختہ شُدم' سوختم

پختگی کیلئے جلنے کو سعادتمندی قرار دے کر جہاں مولانا رومی یہ کہتے ہیں کہ

تانسوزی نیست آن عین الیقین این یقین خواہی در آتش در نشین

وہاں دلسوزی اختیار کر کے اپنی شخصیت کو روشن بنانے کے آداب سکھانے کا اقدام بھی رومی یوں کرتے ہیں

آتشے از عشق دردل برفروز سر بسر فکر و عبارت رابسوز
عشق آں شعلہ است کو چون برفروخت آنچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
عاشقان راہر زمان سوزیدنی است بردہِ ویران خراج و عشر نیست

بلکہ مولانا رومی عشق کو ہی تمام انسانی مسائل کا حل قرار دینے سے بھی نہیں کتراتے چنانچہ درد بسوز کے اسی سرچشمے کی طرف روے سخن کر کے کہتے ہیں۔

شاد باش اے عشقِ خوش سودای ما اے طبیبِ جُملہ علت ہایِ ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

اِتنے اوصافِ عشق بیان کرنے کے باوجود مولانا بوالہوسوں کی کارستانیوں سے ہُشیار رہنے کی زبردست تاکید کرتے ہیں کیونکہ بوالہوس بھی اپنی خرمستیوں کو عشق نام سے ہی یاد کرتے ہیں اور یہی ہم نامی کا المیہ مولانا کو ایک خطِ تنسیخ کھینچنے پر یوں اُکساتا ہے۔

عشق بازی کز پے رنگے بود عشق نبود عاقبت ننگے بود

مولانا عشقِ مجازی کو شہوت رانی جیسا نام دے کر نشاندہی میں لانے کی ضرورت بھی محسوس کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں

عشقے کہ نہ عشقِ جاودانی است بازیچۂ شہوتِ جوانی است

اقبال نے رومی کی طرح جہاں عشقِ حقیقی میں مضمر بے پایان قوت کا اندازہ لگا کر انسانی شخصیت کو پنپ سکنے کے رازیوں اگلے ہیں

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھ کو یہ میری خودنگہداری مرا ساحل نہ بن جائے
عشق دمِ جبرائیل، عشق دلِ مصطفیٰؐ عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات!

وہاں مولانا کی طرح ہی جوانی کی خرمستیوں کو عشق کا نام نہ دینے کی تاکید کرتے ہیں بلکہ اُن خرمستیوں کی تہذیب وتصعید کیلئے کمربستہ ہو جانے کی بات یوں سمجھاتے ہیں کہ

حفظِ تن ہا ضبطِ نفس اندر شباب حفظِ جانہا ذِکر و فکرِ بے حساب

مولانا رومی اور علامہ اقبال دونوں دُکھی انسانیت اور مجروح مِلّت کے ایسے

مُشفق معالج اور حکیمِ حاذق ہیں جن میں عشقِ حقیقی اور عشقِ رسولؐ جیسے درجنوں موضوعات ہی مشترک نہیں بلکہ فنی سطح پر بھی ان میں بے حد مماثلت پائی جاتی ہے خصوصاً صنفِ مثنوی میں اقبال مولانا کی پسندیدہ بحر اور اسلوب کو ہی مرغوب رکھتے ہیں۔ اِن مماثلتوں کے تناظر میں کئی خوش اعتقاد عالموں کی (از خود تحقیق برائے تضحیک قرار دی گئیں) چند قیاس آرائیاں بھی قابل توجہ معلوم ہوتی ہیں مثلاً پروفیسر مفتی جلال الدین کشمیری نے اس انکشاف کو اپنی خاص مگر مضحکہ خیز تحقیق قرار دیا ہے کہ رومی نے نہ صرف نام لے کر اقبال کا پیشگی ذِکر کیا ہے بلکہ جسم اور جان کے باہمی رشتے کو موضوعِ خاص بنانے کا راز بھی اقبال کو بتایا ہے۔ پہلے مفتی صاحب موصوف کا انکساری پر مبنی فتویٰ ملاحظہ فرمایئے۔ لکھتے ہیں ''پیرِ رومی نے اقبال سے متعلق نادرانہ ذِکر (اپنی مثنوی کے) دفتر اول میں پیر چنگی کے قصے کے سلسلے میں لایا ہے۔ اور میں نے یہ اپنی مضحکہ خیز تحقیق اقبال سمینار منعقدہ کلچرل اکیڈیمی (کشمیر) میں درج کی ہے۔ (پیشگی ذِکر یہ ہے)

پیش من بنشین و مہجوری مساز تا بگوشت گویم از اقبال راز

اور وہ رازِ اقبالیات یعنی اقبال کا پیغام کیا ہے۔ اسی بیت کے بعد:

درشکارِ پشۂ جان باز باش ہمچو خورشیدِ جہاں جان باز باش

ہر زمان از غیب نو نو مے رسد ''از جہانِ تن برون شو'' مے رسد۔''

اقبال نے تن اور روح کے باہمی رشتے کی باریکیوں کو مولانا رومی سے ہی سمجھا ہے جبھی تو اپنے قاری کو بھی یہ مشورہ دیتا ہے کہ

پیرِ رومی را رفیق راہ ساز تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

زانکہ رومی مغز را داند ز پوست پائے او محکم فتد در کوئے دوست

اس پراسرار اور نازک رشتے کی کونسی باریکیاں پیر اور مرید کے درمیان زیرِ

بحث آ گئی ہیں اُن کی شرح وبسط کا یہ موقعہ نہیں البتہ اُن کو تقابل میں مہیا رکھنا اہل نظر احباب کیلئے مفید معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ہم حقِ تقدم کو ملحوظ رکھ کر پہلے مولانا رومی کے اُن چند شعروں پر اس موضوع کے حوالے سے غور کریں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر چہ ایک مخلوق کی حیثیت سے آدمی دوسری مخلوقاتِ جہان کی محض ایک شاخ ہے لیکن آدمی کی روح ہی پورے جہان کی اصل اور بنیاد ہے یوں تو آدمی کے تن بدن کو ایک مچھر بھی تردد میں مبتلا کر سکتا ہے حالانکہ آدمی کے باطن یا دُنیاے روح میں سات آسمان بھی سما سکتے ہیں۔ آدمی ہی وہ جوہرِ کائنات ہے جو جسم کے اعتبار سے بھی ایک عالمِ اصغر ہے اور جو روحانی طور پر ایک عالمِ اکبر کا درجہ رکھتا ہے۔ بطورِ جوہر آدمی ایک ایسا سمندر ہے جو چلتے پھرتے دریا میں پوشیدہ ہو گیا ہے درحقیقت دو گز لمبے جسم والے آدمی میں ایک وسیع و عریض دنیا پوشیدہ ہے۔ رومی کے ہاں ان مفاہیم کے حامل اشعار یہ ہیں۔

پس بصورت آدمی فرعِ جہان درصفت' اصلِ جہان این را بدان
ظاہرش راپشۂ آرد بچرخ باطنش باشد محیطِ ہفت چرخ
پس بصورت عالمِ اصغر توئی پس بمعنی عالمِ اکبر توئی
بحرِ علمی دریے پنہان شدہ در دوگز تن عالمے پنہان شدہ

رومی کے مریدِ ہندی نے اپنے پیرِ بزرگوار کے ساتھ منسوب سماع ورقص کے حوالے سے روح اور بدن کے رشتے کو تغزلِ جاوید نامہ کے انداز میں یوں پیش کیا ہے

رقصِ تن درگرد دش آرد خاک را رقصِ جان برہم زند افلاک را
علم وحکم از رقصِ جان آید بدست ہم زمین ہم آسمان آید بدست
رقصِ جان آموختن کارے بود غیرِ حق راسوختن کارے بود

غیرِ حق یا غیر اللہ کو جلاتے ہوئے جو موت بدن کی واقع ہوگی وہ حیاتِ جاودانی کی ضامن ہوگی بقول رومی

مرگِ تن ہدیہ است بر اصحاب راز زرِ خالص راچہ نقصانست گاز
زندگی در مردن و در محنت است آبِ حیوان دردرونِ ظلمت است

اقبال نے جہاں جاوید نامہ میں رومی کی سراپا نگاری کرتے ہوئے ایک منظرنامہ اسرارِمعراج کے حوالے سے یوں ترتیب دیا ہے

روحِ رومی پردہ ہارا بردرید از پسِ کہہ پارہ ئ آمدپدید
طلعتش رخشندہ مثلِ آفتاب شیب اوفر خندہ چون عہدِ شباب
پیکرے روشن زِنورِ سرمدی در سرا پایش سرورِ سرمدی
برلبِ اوسرِ پنہان وجود بندہای حرف وصوت از خود کشود
حرف او آئینہ ی آویختہ علم باسوزِ درون آمیختہ

وہاں اقبال نے روح وتن سے وابستہ موضوع کے چند پہلو فلکِ مریخ کے امکانی باشندوں کے حوالے سے بھی بزبانِ مولانا رومی یوں روشن کئے ہیں

پیرِ روم آن مرشدِ اہل نظر گفت مریخ است این عالم نگر
ساکنانش چون فرنگان ذوفنون در علومِ جان و تن ازما فزون
درجہانِ ما دوتا آمد وجود جان وتن' این بے نمود آن بانمود
خاکیان را جان و تن مرغ وقفس فکر مریخی یک اندیش است و بس
جانِ شان پروردۂ اندام نیست لاجرم خوکردۂ اندام نیست
تن بخویش اندر کشیدن مردن است از جہان درخودر میدن مردن است
برتر از فکرِ تو آمد این سخن زانکہ جانِ تست محکومِ بدن

تن پروری اور جسم پرستی آدمی کیلئے ہمہ گیر زوال کا باعث بنتی ہے۔ اسی لئے قرآنِ پاک میں روح کی پاکیزگی اور تزکیہ نفس سے تن پرستی کے رُجحان پر غالب آنے کا مشورہ دیا گیا ہے اقبال شارحِ قرآن مولانا رومی کے ذریعے یہ نکتہ واضح ہو جانے

کے بعد **قَد اَفلَحَ مَن زکھا** کے تقاضوں کو بخوبی سمجھ لیتا ہے اور اس مادی دور میں جسم پرستی کے اثرات زیادہ زہریلے ثابت ہو سکنے کے اندیشہ کے تحت وہ نئی نسل کو در پیش دیوِ شہوت پر غالب آ جانے کے آداب بھی سکھاتا ہے یوں

ترسم این عصرے کہ تو زادی در آن | در بدن غرق است و کم داند زِ جان
باتو گویم رمزِ باریک اے پسر | تن ہمہ خاک است و جان والا گہر
جسم را از بہرِ جان باید گداخت | پاک را از خاک مے باید شناخت

اقبال کو رومی کا عرفان اور فیضان جن خاص موضوعات میں دستگیری کرتا دکھائی دیتا ہے ان میں سے ایک درد و سوز سے معمور وہ زندگی بخش فنِ شعر ہے جس میں سوزِ حق کا مدعا و مقصد نغمۂ جبریل یا صورِ اسرافیل جیسا با اثر تفاعل رائج کرنا ہو گویا اپنے مرشد کو سراپا سوز و درد قرار دینے کے بعد اقبال کا صرف یہ کہنا ماہرین شعر سے خاص نقد و نظر کا متقاضی نہیں کہ

حق اگر سوزے ندارد حکمت است | شعر مے گردد چو سوز از دِل گرفت

بلکہ یہ بھی کہ وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے | یا نغمۂ جبریل ہے یا صورِ اسرافیل

رومی اور اقبال کے مشترکہ ڈکشن میں سرِ فہرست لفظِ عشق ہونے میں فارسی کے ناقدین کا اتنا ہی دخل ہے جتنا سوز کو اہمیت دینے میں عربی کے ناقدین کا عمل دخل ہے۔ لہٰذا دونوں کے رجحان کو واضح کرنے کیلئے موضوع سے متعلق چند اور شعر پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے پہلے رومی کے یہ اشعار دیکھئے

عشق جوشد بحر را مانندِ دیگ | عشق ساید کوہ را مانندِ ریگ
گرچہ تفسیرِ زبان روشن گراست | لیک عشقِ بے زبان روشن تر است
ہر چہ گویم عشق را شرح و بیان | چوں بہ عشق آیم خجل گردم ازان
عقل در شرحش چو خر درِ گل بخفت | شرحِ عشق و عاشقی ہم عشق گفت

رومی کے پروردہ اسی سوزِ عشق کا عرفان شعرِ اقبال میں اِسطرح کے پھول کِھلاتا ہے

جب عشق سِکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی — کُھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی
عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم — عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دمبدم
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشا بے لبِ بام ابھی
اگر ہو عشق، تو ہے کُفر بھی مسلمانی — نہ ہو، تو مردِ مسلمان بھی کافر و زندیق

عظمتِ انسانی کی ضمانت دینے والے اس عشق میں پوشیدہ امکانات کی نشاندہی کرنے اور اس کو ودیعت کئے گئے زور کو بروے کار لانے کے آداب سکھانے میں بھی اقبال اپنے مرشد کی بات آگے بڑھاتے ہیں مثلاً ایسے اشعار میں

زورِ عشق از باد و خاک و آب نیست — قوتش از سختیٔ اعصاب نیست
عشق بانانِ جوین خیبر کشاد — عشق در اندامِ مہ چاکے نہاد
عشق در جان چوں بچشم اندر نظر — ہم درونِ خانہ ہم بیرونِ در
عشق ہم خاکستر و ہم اخگر است — کار او از دین و دانش برتر است
عشق سلطان است و برہانِ مبین — ہر دو عالم عشق را زیرِ نگین
عشق صیقل مے زند فرہنگ را — جوہرِ آئینہ بخشد سنگ را

اقبال خصوصاً اپنے مشہورِ عالم نظریۂ خودی کو نظریۂ عشق بنا کر پیش کرنے کے معاملے میں رومی سے کس حد تک فیضیاب ہوئے ہیں اس کا تھوڑا سا اندازہ لگانے کیلئے ہمیں بہر حال رومی کے ایسے درجنوں شعر دیکھنے پڑیں گے

اے تو در پیکار خود را باختہ — دیگران را تو ز خود نشناختہ
جوہر آن باشد کہ قائم با خود است — آن عرض باشد کہ فرعِ اوشُد است
گر تو آدم زادۂ چون اونشین — جملۂ ذرات را در خود ببین

رومی کے ایسے ہی اشعار کی صدائے بازگشت اقبال کے ایسے اشعار میں سنائی دیتی ہے

تو راز کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجمان ہو جا

اوپر درج کئے گئے منظوم اقتباسات پیش کرنے کا مدعا صرف یہ نہ تھا کہ عشق ہی رومی اور اقبال کے درمیان سب سے بڑا مشترک شعری موضوع ہونے کی بات واضح کی جائے بلکہ یہ بھی کہ دونوں کے ہاں عشقِ حق کی تان عشق رسولِ محترمؐ پر ٹوٹتی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ رومی کے ہاں یہ عشق خاص رمزو کنایہ کی صورت اختیار کر کے اور شمس تبریزی کی آڑ میں انسانِ کامل کی تلاش کی صورت میں اُسی حسنِ کلام کا لہجہ اپنا کر ظاہر ہو جاتا ہے۔ جس کا معیار خود رومی نے یہ کہہ کر ناقدین ادب کے سامنے رکھا ہے کہ

خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبران
گفتہ آید در حدیثِ دیگران

اور اس معیار کی رعایت سے ہی رومؔی کے ہاں عشقِ رسولؐ اکرم کا اظہار ایسی کوئی صورت اختیار کرتا ہے

اے پناہِ من حریمِ کوے تو
من بہ اُمیدے رمیدم سوے تو

اے وجودِ تو جہان را نوبہار
پرتوِ خود را دریغ از من مدار

باپرستارانِ شب دارم ستیز
باز روغن در چراغِ من بریز

خودبدانی قدرِ تن از جان بود
قدرِ جان از پرتوِ جانان بود

یا ایسی کوئی صورت تخاطب:۔

نازنینِ حضرتِ حق صدرِ بدرِ کائنات
نورِ چشم انبیاؑ چشم و چراغ ماتویی

اقبال آنحضورؐ کی طرف روے سخن کرنے کی جرأت کم ہی کرتا ہے وہ اپنا حساب تک انکی نگاہ سے دور دینا چاہتا ہے

در حسابم را تو گیری ناگزیر
از نگاہِ مصطفیؐ پنہان بگیر

یہ جاننے کے باوجود کہ ؎ برہنہ سخن نگفتن کمالِ گویایسیت ۔اقبال

صنفِ نعت میں سیرتِ پاک کے حوالے سے کردار سازی کی باتیں عرفی کی طرح بلند آہنگ بنانے کا روادار ہے مثلاً ایسی کسی صورت میں۔

دردلِ مومن مقامِ مصطفیؐ است آبروئے ماز نامِ مصطفیٰ است
از کلیدِ دین درِ دنیا کُشاد ہمچو او بطنِ اُم گیتی نزاد

یا طرزِ رومی اپنانے کی سعادت پا کر ایسی کسی صورت میں

ذکر و فکر و علم و عرفانم تویی قطرہ ام دریا و طوفانم تویی
گردِ تو گردد حریمِ کائنات از تو خواہم یک نگاہِ اِلتفات

وَمَارَمَیْتَ اِذرَمَیْتَ ولٰکِنَّ اللہَ رَما جیسی آیاتِ بینات اور دیگر تلمیحاتِ قرآنی کو اقبال بھی رومی کی طرح سے شعر کا حصہ بنانے میں سعادتمندی سمجھتا ہے مثلاً ایسے اشعار میں

نکتۂ اِلاّ بسُلطان یاد گیر ورنہ چون مور و ملخ درگلِ بمیر

یا ایسے اشعار میں

ہر کہ پیمان باھُوَالموجُود بَست گردنش از بندِ ہر معبود رَست
مومن از عشق است و عشق از مومنست عشق را ناممکنِ ماممکن است
اللہ اللہ بای بسم اللہ پدر معنیٔ ذِبح عظیم آمد پسر

رومی کیساتھ قلبی مناسبت کا سب سے بڑا رشتہ سوزِ عشق اور دردمندی سے بھی پہلے اقبال کی یہی قرآن شناسی ہے چنانچہ خود بھی کہا ہے

پیرِ رومی مرشدِ روشن ضمیر کاروانِ عشق و مستی را امیر
نورِ قرآن درمیانِ سینہ اش جامِ جم شرمندہ از آئینہ اش
شعلہ ہا در موجِ دُودش دیدہ ام کبریا اندر سجودش دیدہ ام

پیرِ رومی آن امامِ راستان　　آشنای ہر مقامِ داستان
از نے آن نے نوازِ پاک زاد　　باز شورے در نہادِ من نہاد

اس واشگاف اعلان کے باوجود کہ　　بشنواز نے چو حکایت مے کند

جیسے دردِ فراق والے الفاظ سے اپنی شہکار مثنوی شروع کرنے والا پاک زاد نے نواز مولانا رومی ہی اقبال کا مرشد خاص بننے کا امتیازی مرتبہ رکھتا تھا۔ سرزمینِ مشرق کے اِن دونابغون کے رشتۂ باہم کی بات نامکمل رہے گی اگر اِس بات کی نشاندہی نہ کی جائے کہ رومی نے کیونکر اقبال کو انقلاب پرور شاعری کی تربیت کی ہے تفصیل کی گنجائش نہ جان کر اس ضمن میں بھی ہم اقبال کے خیالات ہی من وعن پیش کریں گے اور فارسی نہ جاننے والوں سے پھر ایک بار معذرت چاہتے ہوئے اقبال شناسوں میں شامل ہونے کا شوق رکھنے والوں کیلئے خوانِ نعمت حاضر رکھیں گے۔ مذکورہ تربیت سے متعلق اقبال کا کہنا ہے۔

رومیِ خود بمود پیر حق سرشت　　کو بحرفِ پہلوی قرآن نوشت
گفت اے دیوانۂ اربابِ عشق　　جرعۂ گیر از شرابِ نابِ عشق
آتش استی بزمِ عالم برفروز　　دیگران راہم ز سوزِ خود بسوز
سنگ شو آئینۂ اندیشہ را　　برسرِ بازار بشکن شیشہ را
نالہ را اندازِ نو ایجاد کُن　　بزم را ازہای وہو آباد کُن
خیز و جانِ نوبدہ ہر بندہ را　　از قُمِ خود زِندہ ترکُن زِندہ را

کلامِ رومی کی وساطت سے شرابِ نابِ عشق میسر ہو جانے سے اگرچہ اقبال خود بھی مرشد کی طرح سراپا آتش بن گیا تھا پھر بھی وہ اپنے ہر قاری کو آتشِ رومی کے سوز میں ہی اپنی ذہنی بیماریوں کا علاج ڈھونڈنے کا مشورہ دیتا رہا یوں

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا　　تری خِرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی نے اس خاص استعارے کے بارے میں یہ

حسنِ ظن بڑی عمدگی کیساتھ پیش کیا ہے کہ آتشِ رومی کا استعارہ صرف اقبال ہی کے ذہنی افق پر روشن ہو سکتا تھا نیز یہ کہ رومی کے افکار کی گرمی اور ابدی تپش کو ان رعایتوں کے ذریعہ ہی بخوبی واضح کیا جا سکتا تھا (شعریات اقبال ص ر ۲۴۸)

اِس مقالے میں بہت سے منظوم اقتباسات نہ صرف اس غرض سے پیش کرنے کی ضرورت لاحق ہو گئی کہ اگرچہ اقبال نے ایسا کوئی عندیہ غالبؔ کی طرح پیش نہیں کیا ہے کہ

بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است   فارسی بین تا بہ بینی نقش ہای رنگ رنگ

پھر بھی واقع یہی ہے کہ اقبال کی عظمت کو پہچاننے کیلئے موصوف کی فارسی شاعری کو ہی خاص اہمیت اور اولیت حاصل ہے خاص طور پر اس لیے کہ فارسی ہی اقبال کے مرشد کا واحد ذریعۂ اظہار ہونے کا شرف پا چکی تھی۔ اسی زبان میں بحیثیت مرید خاص اقبال کو صنفِ غزل میں بھی ایسے آوازے بلند کرنے پڑے تھے کہ

مُطرب غزلے بیتے از مرشدِ روم آور   تا غوطہ زند جانم در آتشِ تبریزی

بیا کہ من زِ خُمِ پیرِ روم آوردم   مئے سخن کہ جوان تر زبادہ ی عنبی است

شعلۂ درگیر زَد بر خس و خاشاکِ من   مرشدِ رومی کہ گفت ''منزلِ ما کبریاست''

ہمیں بہت سے فارسی منظوم اقتباسات شاملِ مقالہ کرنے کی ضرورت اس لئے بھی پیش آئی ہے کہ جس طرح عربی ادب کے ناقدینِ فکر و فن کے ہاں شاعری کی تحسین و تعینِ قدر کا بنیادی عنصر یہی درد و سوز سے معمور جذبات نگاری ہے اسی طرح سے فارسی ادب کے ناقدین کے ہاں محبت میں پیش آنے والے معاملات کی رعایت کو پرکھنا ہی بنیادی عنصر کا درجہ رکھتا ہے۔ ان دونوں عنصروں کا حُسنِ امتزاج رومی کی طرح اقبال کو بھی کمال درجے کا حاصل ہو گیا ہے اور اِس حقیقت کا اعتراف ایران کے ملک الشعراء بہارؔ جیسے بزرگ اور سرکردہ شاعر بھی یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ بیسویں صدی اقبال کی

صدی بن گئی ہے اور وہ ہزاروں شاعروں میں ایک ممتاز سخن ور بن کر اُبھرا ہے واقعاً اس امتیاز میں غالب حصہ اقبال کے رومیٔ ثانی ہونے کا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کی آدم گری کا نظریہ ہو یا رواداری کا نظریہ اس کی خودی کا نظریہ ہو یا بے خودی کا نظریہ ہر کہیں اس پر مولانا رومی کا اثر نمایاں ہے بلکہ اِس دانستہ اور شعوری اثر پذیری نے ہی فکر وفن میں نہایت بلند مرتبہ رکھنے والے اقبال کو رومی کے تئیں فدا کارانہ ارادتمندی کے اس مقام پر پہنچایا ہے جہاں رومی کی بعض خامیوں پر انگشت نمائی کرنے والوں کے سامنے وہ دل کی گہرائیوں سے مرشدِ موصوف کے ذکر میں کہہ اُٹھتا ہے کہ

پُختہ تر کارش ز خامی ہائے او
من فدائے ناتمامی ہائے او

اقبال اور شیخ سعدیؒ

بیسویں صدی کے نابغۂ روزگار، برصغیر کے شاعرِ صد افتخار اور ادبِ عالیہ کے عہد ساز معمار علامہ اقبال کے تخلیقی ذہن پر ایران کی جن عظیم شخصیتوں نے گہرا اثر ڈالا ہے اُن میں مولانا رومی اور امام غزالی کیساتھ جلیل القدر علامۂ دہر، اُستادِ غزل اور بے نظیر معلمِ اخلاق شیخ سعدی شیرازی کا اسمِ گرامی بھی خصوصیت کیساتھ شامل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جہاں مرزا غالبؔ نے غنی کشمیری سے کئی طرح کا فیض پانے کے باوجود اُس کے احسانات کا ذِکر اُس شکر گذاری سے نہیں کیا ہے جس طرح اس نے ظہوری، بیدلؔ اور صائبؔ کے فیضان کا ذکرِ خیر کئی کئی بار کیا ہے وہاں اقبال نے بھی اُس تشکّر کے ساتھ عالم نواز حضرتِ سعدی کا ذکر نہیں کیا ہے جس طرح اس نے مولانا رومی کے فیضان کو بتکرار اُجاگر کیا ہے۔ حالانکہ اقبال کے نظریات کی مشاطہ گری میں جو رول سعدی کے افکار اور احترامِ آدمیت سے متعلق روشن اِرشادات نے انجام دیا ہے وہ افکارِ رومی کے رول سے کسی طرح کم اہمیت کا نہیں۔ خاص طور پر جہاں تک اقبال کے نظریۂ آدمیت اور آدم گری کا تعلق ہے اور جہاں تک اس کی فلسفہ بیزاری اور تصوف میں وحدۃ الوجودی یا ہمہ اوست نظریہ سے بیزاری کا تعلق ہے۔ ہم تنگ دامانیٔ وقت کو ملحوظ رکھ کر آج کی نشست میں انہی چند نکات کے تناظر میں اظہار خیال کریں گے۔ پہلے دُنیائے اُردو میں مشہور اُس مقولے سے تمہید کا کام لینا ہوگا جو اِن الفاظ پر مشتمل ہے کہ اگر حالی نہ ہوتے تو اقبال نہ ہوتے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر کا یہ بیان بھی قابلِ پذیرائی ہے کہ ''حالی نے تو صرف قوم اور دہلی مرحوم کا مرثیہ کہا تھا لیکن اقبال نے مردہ قوم کو حیات آموز فلسفہ

بھی دیا ہے''۔ یوں تو حالی اور اقبال کے روحانی مماثلت والے رشتے کے حوالے سے ضمناً اُس حسنِ ظن کو بھی تقویت بہم پہنچتی ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ پاک سے یہ سننے پر کہ بارگاہِ ایزدی میں تحفۃً پیش کرنے کیلئے کون سی چیز لائے ہو تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ فوراً اپنے عزیز ترک زادہ امیر خسرو کے دفتر شعر کو پیش کریں گے بالکل اسی طرح کا کوئی سوال سُن کر سرسیّد احمد خان مسدسِ حالی المعروف ''مدو جزرِ اسلام'' پیش کریں گے دراصل مذکورہ مقولہ اور حُسنِ ظن اُس گہری وابستگی کا دوہرا اعتراف ہے جو اقبال کو پیر رومی سے پہلے پیرِ ہندی مولانا الطاف حسین حالی کے ساتھ پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ اُسی عقیدت و محبت کا جذبۂ خاص دلِ اقبال میں اس وقت بھی موجزن تھا جب ''فردوس میں ایک مکالمہ'' عنوان سے وہ فکر انگیز اور دردمندی سے لبریز نظم تخلیق ہوگئی تھی جسکا آغاز ان اشعار سے ہوا ہے

ہاتف نے کہا مجھ سے کہ فردوس میں اک روز — حالی سے مخاطب ہوئے یوں سعدیٔ شیراز
اے آنکہ ز نورِ گہرِ ''نظمِ فلک تاب'' — دامن بچراغ مہ و اختر زدۂ باز
کچھ کیفیتِ مُسلمِ ہندی تو بیاں کر — تھی جس کی فلک سوز کبھی گرمیٔ آواز

اِس اہم سوال کا جواب حالی کن الفاظ میں دینے لگتا ہے اُن کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے

باتوں سے ہوا شیخ کی حالی جو متاثر — رو رو کے لگا کہنے کہ ''اے صاحبِ اعجاز''
جب پیرِ فلک نے ورق ایّام کا اُلٹا — آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اُس سے عقیدوں میں تزلزُل — دُنیا تو ملی، طائرِ دیں کر گیا پرواز
پانی نہ ملا زمزمِ ملّت سے جو اِس کو — پیدا ہیں نئی پود میں اِلحاد کے انداز
یہ ذِکر حضورِ شہ یثربؐ میں نہ کرنا — سمجھیں نہ کہیں ہند کے مسلم مجھے غماز

''خرما نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم

دیبانتواں بافت ازاں پشم کہ رِشیتم"

تضمین کی صورت میں صاحبِ اعجاز قرار دیئے گئے شیخ سعدی کے شعر سے وہی روشنی برآمد ہونے کا احساس دلایا گیا ہے۔ جو مولانا رومی کے ایسے اشعار میں موجود ہے

دستِ ہرنا اہل بیمارت کُند سوے مادر آکہ تیمارت کُند

عالمگیر شہرت والے شیخ سعدی کے بارے میں آپ سب یہ بات جانتے ہونگے کہ فارسی نظم ونثر کو ترقی بخشنے میں اس عظیم اُستادِ ادب کا دبستانِ مشرق میں کوئی ثانی نہیں ہے۔ تمام شعری اور نثری قالبوں کو نئی رفعتوں اور نئی وسعتوں تک رسائی بخشنے والے سعدی کے بارے میں جدید ایران کے ایک فاضل نقاد کا وہ بیان کسی مبالغہ پر مبنی نہیں جو موصوف نے سعدی کو تمام اصنافِ سخن میں استادِ بزرگ قرار دے کر ایک شاعرانہ تعلی کی پذیرائی کرتے ہوئے یوں دیا ہے "میدانیم سعدیؔ در تمام انواعِ سخن اُستادے بزرگ است چناں کہ خود گفتہ است

در حدیثِ من و حُسنِ تو نیفز ایدکس
حد ہمیں بُود سخن گوی و زیبائی را"

نقاد موصوف نے سعدی کی زبان سازی کا قریب الاعجاز کارنامہ بھی بڑے بلیغ انداز سے نشاندہی میں لایا ہے یہ کہہ کر کہ اُسی کی بدولت ایران کو وہ زبان ملی ہے جس میں سو سال بعد شعر کہہ کر حافظؔ جیسے بلند پایہ شاعر خاص کمال دکھا سکے بلکہ اقبال کے عہد تک بھی وہی فارسی قبولِ عام حاصل کر سکی ہے جس کو سعدی نے رواج اور عروج بخشا تھا۔ نقاد موصوف کا عقیدہ ہے کہ سعدی کا عظیم رتبہ اگلی صدیوں میں بھی نہیں گھٹے گا لکھا ہے "استادیٔ سعدی در سخن تا حد یست..... کہ پس از صد سال حافظؔ باہماں زبان سخن گفتہ وحتی امروزہ ما نیز بہ ہمان زبان سعدی مے گوئیم..... چیزی از عظمت قدر و استادیٔ

سعدیؔ نخواہد کاست"۔

سعدی کی کثیر الجہات شخصیت کے ان سب پہلوؤں کا عرفان اقبال کو صرف اس حد تک دستگیری نہیں کرتا کہ وہ بال جبرئیل میں ساقی نامہ جیسی اپنی لافانی نظم کا خاتمہ سعدی کے اس شعر پر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

اگر یک سرے موے برتر پرم فروغِ تجلّی بسوزد پرم

بلکہ وہ بحیثیتِ آدمی احترامِ آدمیت اپنانے اور بحیثیت شاعر فنونِ لطیفہ کو وقفِ آدم گری کرنے سے متعلق اپنے ایک گرانقدر نظریے کی اساس بھی سعدی کے خیالات پر ہی استوار کرتے ہیں۔ آیئے پہلے ہم یہی دیکھیں کہ اپنے جس نظریے کا ماٹو اقبال یوں ترتیب دیتا ہے

آدمیت احترامِ آدمی باخبر شواز مقامِ آدمی

اُس کی تدوین و تشکیل میں سعدی کے کیسے روشن اور بصیرت افروز خیالات کارفرما رہے ہیں۔ عہد حاضر میں ایک عرصہ تک ہنگامہ خیز لگنے والی آدمیت کُش تھیوریوں خصوصاً ڈارونِ اور فرائیڈ کی تھیوریوں کے برعکس آدمیوں کو عزتِ نفس اور

بقائے نوع کا احساس بخشنے والی جو تھیوری اقبال نے پیش کی، بنی نوع انسان کے ایک باپ "آدمؑ" اور ایک ماں "حوا" ہونے کے عقیدے پر انبیائے کرام نے اُسی کے الہام کی نور پاشی کی تھی دراصل انبیاء کے ذات پات، نسلی تعصب اور نفرت سے بالاتر ہونے کا سچ

صاحب دل شعراء پر بھی القا ہو گیا ہے۔ اُسی نُور نے آفاقی اپیل والی شاعری کے ممتاز مشرقی نمائندہ شیخ سعدی کو یہ نکتہ واضح تر بنانے کا سلیقہ بخشا تھا کہ ایک آدم کی اولاد ہونے کے ناطے پیدائشی طور پر ہم سب ایک جوہرِ لطیف سے تعلق رکھتے ہیں اُس لطافت کا مفہوم سعدی کے الفاظ میں ہی صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہتے ہیں:

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند کہ در آفرینش زیک جوہرند

چو عضوے بدرد آورد روزگار   دِگر عضوہارا نہ ماند قرار
تو کز محنتِ دیگراں بے غمی   نشاید کہ نامت نہند آدمی

یہ ناطق فتویٰ اقبال کو صرف اس عقیدے کا قائل نہیں بناتا کہ دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو۔ بلکہ اُس پر یہ نکتہ بھی روشن ہو گیا ہے کہ دوسروں کے دُکھ درد بانٹنے والے آدم زاد کو ہی آدمی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقبال کی نظر میں ایک صاحبِ دل آدمی کو دیکھ کر تارے بھی لرزہ براندام ہیں:

عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں   کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

اگر آدمی اپنے اندر قدرت کے ودیعت کردہ اُن امکانات کو پہچان لے تو درد و سوز اور جذبۂ محبت کی تربیت سے وہ مقامِ بندگی کے عوض مقامِ خداوندی قبول کرنے پر بھی آمادہ نہ ہو گا گویا وہ از خود کہہ اُٹھے گا:

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی   مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

سعدی آدمیت کے آداب کی باضابطہ نشاندہی کرتے ہیں وہ طاقت اور صلاحیت کو درندوں کی طرح استعمال کرنے پر نہیں بلکہ اپنے خداداد جوہروں کی تہذیب و تصعید کرنے پر زور دیتا ہے وہ اِنکساری اختیار کرنے اور دوسروں کے کام آنے کی تاکید کرتا ہے اور دُنیا کو عبرت کی کھلی کتاب جان کر دُوسروں کے عروج و زوال پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے کبھی ایسے اشعار کہہ کر:

اگر خود بر دَرد پیشانیٔ پیل   نہ مرد است آنکہ در وے مردمی نیست
بنی آدم سرشت از خاک دارد   اگر خاکی نباشد آدمی نیست

اور کبھی یوں رطبُ اللسان ہو کر:

بِرو اندر جہاں تفرّج کُن   پیش ازاں روز کز جہاں بِروی

سعدی ایک آدمی زاد کو آدمیت کے حقیقی جوہر سے سرافراز ہونے کے لئے

چند بنیادی تقاضوں کی واضح نشاندہی کرتے ہیں۔ پہلا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دوسرے حیوانات سے ممیّز کرنے والی عقل کو عقل سلیم بنا کر بروئے کار لائے اور اشرف المخلوقات سے منسوب وہ ادب حاصل کرلے جس کے بارے میں رومی نے کہا ہے

از خدا مے خواہ توفیقِ ادب بے ادب محروم گشت از فضلِ ربّ

سعدی نے فضلِ رب سے محروم ہو جانے کا یہ پہلو قابلِ فہم بنایا ہے کہ اگر کوئی اپنی عمرِ عزیز کے چالیس سال میں بھی عقل کو بروے کار لانے کے تقاضے نہ نبھائے گا اور اشرف المخلوقات والے ادب کو نہ اپنائے گا تو وہ ہرگز آدمی کہلانے کا مستحق نہ ہوگا۔

دگر چل سالہ را عقل و ادب نیست بتحقیقش نشاید آدمی گفت

سعدی کی نظر میں ایک آدمی کو دوسرے حیوانات پر فضیلت پانے کیلئے عقلِ سلیم کا وہ عملی اظہار چاہئے جو اس کے کردار میں غیرت مندی اور جوانمردی کیساتھ ساتھ شعورِ ادب کا آئینہ دار بھی ہو ورنہ آدمی بزعمِ خود بیرونی بناؤ سنگھار سے آدمی کا رُوپ دھار کر بھی ننگِ آدمیت ہوگا یا زیادہ سے زیادہ کسی دیوار پر لٹکنے والی آدمی کی رنگیں تصویر کی مانند بے جان ہوگا۔ آدمیت آموز سعدی کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

آدمی فضل بردِگر حیوان بجوانمردی و ادب دارد
گر تو گوئی بصورت آدمیم ہوشمند این سخن عجب دارد
پس تو ہمتایِ نقشِ دیواری کو ہمیں گوش و چشم و لب دارد

سب آدمیوں کو اولادِ آدم قرار دینے والا عقیدہ کتنا بڑا انعام ہے سعدی ہی جانتا ہے:

سعدیٔ خویشتنم خوان کہ بمعنی زِ توام کہ بصورت نسب از آدم و حوّا دارم

انہی خیالات کی صدائے بازگشت ہمیں اقبال کے اشعار میں جابجا سُنائی دیتی ہے خصوصاً اُن کی مایہ ناز تصنیف جاوید نامہ میں جہاں وہ عقل و ادب اور جوانمردی و

غیر تمندی کے آئینہ دار کردار کو پیدا کرنے کیلئے واضح اہداف کی نشاندہی ایسے اشعار میں کرتے ہیں:

برتر از گردون مقامِ آدم است — اصلِ تہذیب احترامِ آدم است
در ضمیرش ممکناتِ زندگی — از تب وتابش ثباتِ زندگی
گفت حکمت را خداخیرِ کثیر — ہر کجا این خیر رابینی بگیر
از جلالِ بے جمالے الامان — از فراقِ بے وصالے الامان
بے محبت علم و حکمت مردۂ ی — عقل تیرے بر ہدف ناخوردئی

تیر بہدف عقل اقبال کی نظر میں وہی عقلِ سلیم ہے جس کو تقویت بخشنے والے علم وحکمت کی بنیاد آدابِ محبت پر ہوگی کیونکہ انسانی محبت اور باہمی خاطر مدارات و شفقت کا نام ہی رواداری ہے۔ رواداری کا تصور بھی کلامِ اقبال کے دیگر حاوی موضوعات میں ایک شہ موضوع کی حیثیت سے شامل ہے۔ آپس میں خیر خواہی، تحمل اور برداشت کا مادہ بڑھانے کے آداب سکھا کر مختلف مذاہب اور مسالک سے وابستہ انسانوں کو بقاے باہمی کے اصول سمجھانے میں بھی اقبال کا رہبر شیخ سعدی ہی ہے۔ شجرِ آدمیت کی سب سے زیادہ شاخِ ثمر دار اور شاخِ بلند کا نام رواداری ہے۔ جس آدمی میں تحمل اور برداشت کا مادہ رواداری کا رویہ پیدا کرنے سے قاصر رہے گا وہ معاشرے اور سماج کیلئے ایک شجر بے ثمر کی مانند ہوگا بقولِ سعدی

آدمی راکہ جانِ معنی نیست — درحقیقت درختِ بے ثمر است

وسعت دِلی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی دشمن کو اپنے اچھے سلوک سے دوست بنائے اور آدمیت کا ثبوت ذاتی قوتِ برداشت کو بروئے کار لا کر دے سعدی اِس ضمن میں اُس حافظ شیرازی کا بھی پیشرو ہے جس نے دنیا اور آخرت کی بھلائی کا راز دوستوں کے ساتھ وفاداری اور دشمنوں کے ساتھ رواداری اختیار کرنے کو قرار دیا ہے یہ کہہ کر کہ

آسائشِ دو گیتی تفسیر این دو حرف است		با دوستان تلطّف با دشمنان مدارا

سعدی اس ضمن میں حافظ سے کئی قدم آگے نظر آتے ہیں جب وہ دنیا میں کامیابی پانے کی حکمت عملی رواداری اور خاطر مدارات کو قرار دے کر ایسی گُل افشانئ گفتار سے کام لیتے ہیں:

مُدارای دشمن بہ از کار زار		ہمے تا بر آید بتدبیر کار
بنعمت بباید درِ فتنہ بست		چو نتواں عدُورا بقوت شکست
بتعویذِ احسان زبانش ببند		گر اندیشہ باشد ز خصمت گزند
نباید کہ پُر خاش جوئی دِگر		چو دشمن بعجز اندر آمد زِدر

دشمن کا تمہارے ماتحت ہونا یا اقلیت جیسی کسی کمزوری کے باعث تمہارے ہاں پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہونا اُس کیلئے کیا کم سزا ہے کہ تم اُس کو اور کسی طرح بھی ستانے بیٹھو اور اپنی عاقبت خراب کرو بلکہ اگر دشمن غالب آ کر تمہارے ساتھ بدسلوکی روا رکھتا ہے تو اُس کو بھی ایسا کُتا سمجھو جس کے کاٹنے کا جواب کاٹنے سے نہیں دیا جا سکتا بلکہ بقولِ غالبؔ

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

کے مصداق کبھی ایسے وقت بھی سعدی کا ایسا کوئی شعر پڑھ کر دل کا بوجھ ہلکا کر لو:

به از آدمیانِ مردم آزار		گاوان و خرانِ بار بردار

اور کبھی ایسے وقت سعدی کا مشہورِ عالم منظوم افسانہ یاد کر لو جس میں ایک ننھی بیٹی باپ کو پاؤں میں کتے کے دانتوں کے نشان اور شدید تکلیف دیکھ کر یہ پوچھتی ہے کہ اپنے دانتوں سے کتے کو کیوں نہ واپس کاٹا تو باپ کا جواب تھا کہ شدید تکلیف پہنچنے کے باوجود آدمی کُتے کے ساتھ کُتا پن اختیار نہیں کر سکتا۔ سعدی کے اشعار میں اِس آدمی پن

کی کیسی مشعل فروزان ہے خود ملاحظہ کیجئے:

سگے پای صحرا نشینے گزید — بخشمے کہ زہرش زدندان چکید
شب از درد بیچارہ خوابش نبرد — بخیل اندرش دخترے بود خورد
پدر را جفا کرد و تُندی نمود — کہ آخر ترُا نیز دندان نبود ؟
پس از گریہ مردِ پراگندہ روز — بخندید کای بابکِ دلفروز
مرا گرچہ ہم سلطنت بودبیش — دریغ آمدم کام و دندانِ خویش
محال است اگر تیغ برسر خورم — کہ دندان بپایِ سگ اندر بُرم

معلمِ اخلاق سعدی اس آدمی پن پر کتنا پکا یقین رکھتے تھے اُس کا آئینہ یہ اشعار خوب دکھاتے ہیں

بشیرین زبانی و لطف و خوشی — توانی کہ پیلے بموئے کشی
لطافت کن آنجا کہ بنی ستیز — نبرد قزِ نرم را تیغِ تیز

اقبال کی شاعری کا سب سے نمایاں اور مرکزی موضوع خودی ہے۔ اس شہ موضوع کے کئی پہلو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں واضح تر بنانے میں خصوصاً نکتۂ الابسلطان کے حوالے سے لایق پرواز بن سکنے کے امکان کو سمجھانے میں سعدی واقعاً رومی سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ اقبال کو جہاز عنوان کی نظم میں سعدی کے ہی اِن شعروں پر تضمین کی سوجھی ہے

مگر اے نگاہِ تو برچون و چند — اسیرِ طلسمِ توپست و بلند
تو کارِ زمین را نکو ساختی — کہ با آسمان نیز پرداختی

اسی طرح اقبال کو سعدی نے عزت نفس کا ایسا شعور بھی بخشا ہے۔

اے طائرِ لاہوتی اس رِزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اَولیٰ! — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

آئینِ جوانمردان حق گوی و بیبا کی　　اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

چنانچہ اقبال کے اِس شعور و احساس کو سعدی کے چند شعروں کی صدائے بازگشت کے طور پر پہنچاننے سے نہ صرف خودی بلکہ اقبال کی بے خودی بھی قابلِ فہم بن جائے گی مثلاً

زِ بہر دِرَم سر ہمتم فرونمے آید　　بِبستہ ام درِ دکّان زبے خریداری

من آبروے نخواہم زبہرِ نان دادن　　کہ پیش طایفہ ای مرگ بہ کہ بیماری

ترا کہ ہمت و اقبال وفر و بخت انیست　　بہر چہ سعی کنی دولتت دہد یاری

اس بند کے دوسرے شعر کی روح اقبال کے ان شعروں میں بھی حلول کر گئی ہے

خودی کے نگہباں کو ہے زِہر ناب　　وہ نان جس سے جاتی رہے اُسکی آب

وہی نان ہے اُس کیلئے ارجمند　　رہے جس سے دُنیا میں گردن بلند

اسی طرح خودی کے جوہر کو انفرادی سطح پر پروان چڑھا کر ملت اور قوم کیلئے ایک سودمند شہری بننے کی جو تاکید ایثار و قربانی اختیار کرنے کیلئے اشعار اقبال میں ملتی ہے اور جو تحریک خودی کو ابلیسی خودی یا غرور و تکبر کے بجائے خودشناسی و خودفروزی بنا کر اجتماعی زندگی کے تئیں جذبۂ خدمت اور ایثار دکھانے کا تقاضا کرتی ہے وہ اقبال سے خودی کے بارے میں ایسے اشعار کہلواتی ہے

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں　　جو ناز ہو بھی تو بے لذتِ نیاز نہیں

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں　　تو آبجو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

اسی طرح رومی اور سعدی کی تربیت اقبال سے بے خودی کے بارے میں ایسے اشعار کہلواتی ہے

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ　　پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں
دامنِ دین ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں　　اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملّت بھی گئی

ان نظریات کے چند اساسی پہلو سعدی کے ان اشعار میں بھی دیکھئے

کہ گفت من خبرے دارم از حقیقتِ عشق　　دروغ گفت کہ از خویشتن خبر دارد
محبت با کسے دارم کزو با خود نمے آیم　　چو بلبل کز نشاطِ گُل فراغ از آشیان دارم

سعدی کا سب سے نمایاں اثر اقبال کے اس روئے پر ہے جو تصوف کے تئیں کشش و گریز سے عبارت ہے جو اس کو بزرگ صوفیاء کے تئیں گہری عقیدت اختیار کرانے کے باوجود تصوف کے نام پر پھیلے ہوئے کئی منفی رجحانات کے تئیں اس کو گہری نفرت ظاہر کرواتا ہے خصوصاً جو ہمہ اوستی یا وحدۃ الوجودی نظریے کے ساتھ اُس کو زبردست اختلاف پر اُبھارتا ہے مقالہ کو طوالت سے بچانے کیلئے اس ضمن میں اقبال کی چند سطریں پیش کرنے کے بعد ہم یوسف حسین خانصاب کے ایک اقتباس پر اکتفا کریں گے۔ اقبال اپنے سب سے بڑے نقاد بلکہ مخالف خواجہ حسن نظامی کے نام ۳۰ر دسمبر ۱۹۱۵ء کے روز لکھے گئے خط میں رقمطراز ہیں۔

''اسلام حقیقت میں اُس (رہبانیت) کیخلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ تصوف جو مُسلمانوں میں پیدا ہوا (اور تصوف سے میری مراد ایرانی تصوف ہے) اس نے ہر قوم کی رہبانیت سے فائدہ اٹھایا ہے اور ہر راہبی تعلیم کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے..... اصل بات یہ ہے کہ صوفیاء کو توحید اور وحدت کا مفہوم سمجھنے میں سخت غلطی ہوئی ہے یہ دونوں اِصطلاحیں مُرادف نہیں بلکہ مقدم الذکر کا مفہوم خالص مذہبی اور مؤخر الذکر کا مفہوم خالص فلسفیانہ ہے۔ توحید کے مقابلے میں یا اس کی ضد کثرت نہیں جیسا کہ صوفیاء نے تصور کیا ہے بلکہ اس کی ضد شرک ہے۔ وحدۃ الوجود کی ضد کثرت ہے۔ اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے وحدۃ الوجود یا زمانۂ حال کے

فلسفۂ یورپ کی اصطلاح میں توحید کو ثابت کیا وہ موحد تصور کئے گئے حالانکہ ان کے ثابت کردہ مسئلے کا تعلق مذہب سے نہ تھا۔'' اس موضوع پر اقبال نے کئی موقعوں پر تفصیلی بحث کی ہے ان سب کی روشنی میں ڈاکٹر یوسف حسین خان کا یہ استنتاج بڑی حد تک دُرست ہے کہ'' حافظ کے عقائد وخیالات پر مولانا روم اور سعدی شیرازی کے متوازن نقطۂ نظر کا اثر نمایاں ہے۔ وہ اسلامی توحید کا قائل تھا نہ کہ وحدتِ وجود کا..... اقبال بھی حافظ اور سعدی کی طرح وحدتِ وجود کا مخالف تھا..... اقبال نے توحید کے عقیدے کو اپنا اور اپنی جماعت کا'' سرمایۂ اسرار'' قرار دیا ہے۔ اُن ہی اسرار کی تفہیم پر ملّت کا شیرازۂ افکار منحصر ہے۔ اگر انکی غلط تاویل وتوجیہہ کی گئی تو یہ شیرازہ منتشر ہوجائے گا۔

ملّتِ بیضا تن وجان لا اِلٰہ سازِ مارا پردہ گردان لا اِلٰہ
لا اِلٰہ سرمایۂ اسرارِ ما رشتہ اش شیرازۂ افکار ما

جب تک اِنسان خالص توحید کا رمز شناس نہیں ہوتا۔ اُس وقت تک غیر اللہ کی غلامی سے اسے رُستگاری نہیں مل سکتی۔

نقطۂ ادوارِ عالم لا اِلٰہ منتہای کارِ عالم لا اِلٰہ
تانہ رمزِ لا اِلٰہ آید بدست بندِ غیر اللہ رانتواں ۔شکست

توحید کی طرح رِسالت کا عرفان بخشنے میں بھی سعدی کا رول اقبال کے ہاں بہت گہرے اثرات مرتب کرنے والا ثابت ہوگیا ہے۔ چنانچہ جہاں ان کی ساری شاعری میں اس تصور کی ضوفشانی محسوس ہوتی ہے کہ راہِ سلوک یا راہِ تصوف (جس کو سعدی راہِ صفا کہہ کر بھی یاد کرتے ہیں) پر چلنے کی کامیابی اور سعادت اسی کو حاصل ہوسکتی ہے جو مکمل اتباعِ رسولؐ کے تقاضوں کو پورا کرتا ہو ورنہ وہ راہِ صفا کے نام پر راہِ ضلالت اختیار کرلے گا اگرچہ بزعمِ خود وہ زہد واحسان یا اسلامی تصوف وسلوک سے

وابستہ ہونے کا دعویٰ کرتا بھی رہے۔ کہا ہے

محال است سعدی کہ راہِ صفا تواں رفت جُز در پئے مصطفیٰؐ
خلافِ پیمبر کسے رہ گزید کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

انہی الفاظ کی روشنی میں اقبال کا وہ اظہار کافی زوردار بن گیا ہے جس میں وہ مولانا حسین احمد مدنی کو اپنی تلخ تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں۔

بمصطفیٰؐ برسان خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بُولہبی است !

اقبال اور امام غزالیؒ

علامہ اقبال نے اسلامی علوم کو فروغ دینے والی اور فکر و فلسفہ میں انقلاب لانے والی جن عہد ساز شخصیات کو اپنے شعر کا موضوع بنانے کے علاوہ اپنی نثر میں بھی نہایت قدر و منزلت اور عقیدت کے ساتھ پیش کیا ہے ان میں حجۃ الاسلام امام محمد غزالی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ اگرچہ اپنے خطباتِ مدراس (Reconstruction of Religious thought in Islam) اور بعض مکتوبات میں بھی علامہ اقبال نے عظمتِ غزالی کے چند پہلو اُجاگر کئے ہیں تاہم امام موصوف کی امتیازی حیثیت کو دوسرے تمام مسلم فلسفیوں اور مفکروں کے مقابل میں نمایاں کرنے کا اقدام خصوصاً اُس تحقیقی مقالے میں کیا ہے جس کا عنوان The development of metaphysics in persian ہے اور جس کو اردو میں میر حسن الدین نے ''فلسفہ عجم'' نام سے شائع کیا ہے۔ اس مقالے کی یہ چند سطریں بھی ان دو عظیم مسلم دانشوروں کی ملتی جلتی فکری اساس محسوس کرا سکتی ہیں۔ ''الاشعری (ولادت ۸۷۳ء) نے علمائے عقلیت (معتزلہ) سے تعلیم پا کر خود انہی کے طریقوں سے ان کی اس عظیم الشان عمارت کو منہدم کرنے کی کوشش کی جو بڑی محنت سے تعمیر کی گئی تھی۔ اشاعرہ کے نزدیک خدا انتہائی واجب الوجود ہستی ہے اور اپنی صفات کو اپنی ہی ہستی میں رکھتا ہے..... اگر ہم غزالی (المتوفی ۱۱۱۱ء) کے کارناموں کو نظر انداز کر دیں تو اشاعرہ کے مابعد الطبیعات کا ذکر بالکل نامکمل رہ جائے گا۔ غزالی کے متعلق اکثر راسخ العقیدہ متکلمین کو غلط فہمی ہوئی ہے لیکن ان کا شمار ہمیشہ اسلام کی عظیم الشان شخصیتوں میں ہوگا..... غزالی پہلے شخص ہیں

جنہوں نے فلسفہ کا ایک باضابطہ رد لکھا اور راسخ العقیدہ لوگوں پر عقلیت (وفلسفے) کا جو رعب چھا گیا تھا اُس کو کامل طور پر زائل کر دیا۔ انہی کا یہ اثر تھا کہ ایک ایسا نظامِ تعلیم وجود میں آ گیا جس سے شہرستانی، الرازی اور الاشراقی جیسے مفکرین پیدا ہو گئے۔ چونکہ اقبال کے مرشد رومی کا تعلق بھی غزالی کے ہی دبستان سے ہے اور چونکہ رومی کے مرشد خاص منطق الطیر مثنوی کے مصنف عظیم صوفی شاعر شیخ فرید الدین عطار بھی نظریہ غزالی کے ہی علمبردار ہیں اسلئے جب سحر خیزی یا آہِ سحر کے حوالے سے اقبال کو چند مشاہیر اسلام کا نام لینے کی شاعرانہ ضرورت لاحق ہوتی ہے تو اس کے تخلیقی ذہن میں فوراً امام غزالی کا نام آتا ہے، یا غزالی سے پہلے علمِ کلام کی بنیاد رکھنے والے امام رازی کا نام یا پھر غزالی کے ہم خیال عطار اور مولانا رومی کا نام آجاتا ہے یوں:

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو غزالی ہو کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

اگر چہ علامہ اقبال خود ایک ماہرِ فلسفہ ہیں اور فلسفی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن یہ غزالی کا ہی اثر تھا کہ وہ فلسفہ سے پوری طرح بیزار ہو گئے تھے اور اپنی آخری تصنیف ارمغانِ حجاز میں یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ فلسفہ مجھے بہر حال ناقص نظر آیا ہے اور زندگی کے ہر مسئلے کو کھولنے یا ہر بند پڑے ہوئے دروازے کو کھولنے کی کرامت میں نے مولانا رومی اور مولانا جامی کے کلام میں موجود پائی ہے۔ چنانچہ کہا ہے ؎

مرا از منطق آید بوی خامی دلیلِ او دلیلِ ناتمامی
برویم بستہ در ہارا کُشاید دو بیت از پیر رومیؔ یازِ جامیؔ

غزالی کے زیرِ اثر اختیار کی گئی فلسفہ بیزاری کا اظہار اقبال زبورِ عجم میں بھی یوں کرتے ہیں ؎

بہ پیچ وتابِ خرد گر چہ لذتِ دگر است یقینِ سادہ دلان بہ زِنکتہ ہای دقیق

ہزار بار نکو تر متاع بے بصری　　زدانشی کہ دل اور انمی کند تصدیق
کلام و فلسفہ از لوحِ دل فرو شُستم　　ضمیرِ خویش کُشا دم بہ نشترِ تحقیق

اس بند کے آخری شعر میں بڑی قطعیت کے ساتھ یہ اعلان کیا گیا ہے کہ فلسفے کی خامیوں سے پوری طرح واقف ہو جانے کے بعد میں نے اپنی لوح دل سے علم کلام اور فلسفہ کے نام ہی دھوڈالے ہیں اور میں نے اپنے ضمیر کو اجتہاد و تحقیق کا نشتر سہنے کیلئے تیار کرلیا ہے۔ خیر فلسفی شاعر اقبالؔ کی (عرفانِ خودی) والی شخصیت میں خطبات مدراس دینے سے بہت پہلے یہ تبدیلی آچکی تھی جیسا کہ ''ری کنسٹریکشن آف ریلی جس تھاٹھ اِن اسلام'' میں شامل پہلے ہی خطبہ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں اقبال نے دوٹوک الفاظ میں اس بات کی نشاندہی کر لی ہے۔ کہ مسلم فلاسفروں پر یونانی فلسفے کے منفی اثرات جب انتہا کو پہنچ گئے تو ان میں ابن رُشد جیسا گمراہ کن مفکر کئی طرح کی جسارتِ بے جا کا اِرتکاب کر سکا اقبال کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں لکھتے ہیں۔ ''غزالی کے ذاتی حالات کا تقاضا تھا کہ امام موصوف نے مذہب کی بنا فلسفیانہ تشکک پر رکھی حالانکہ یہ مذہب کی کوئی محکم احساس ہے نہ تعلیمات قرآنی کے مطابق ہے۔ آگے چل کر غزالی کے حریف اعظم ابن رشد (جو گویا غزالی جیسے باغیوں کے خلاف بزعمِ خود یونانی فلسفے کی حمایت میں سینہ سپر تھا) نے ارسطو کی پیروی میں بقائے عقلِ فعال کا عقیدہ وضع کیا۔ جسکا ایک زمانے میں فرانس اور اٹلی کے ذہنی حلقوں پر بڑا اثر پڑا تھا۔ لیکن جو میری رائے میں اس تصور کے سر تا سر خلاف ہے جو قرآن پاک نے نفسِ انسانی کی قدر و قیمت اور مقصود و منتہا کے بارے میں قائم کیا۔ یوں ابنِ رشد اسلام کے ایک نہایت اہم اور پُر معانی نثر کے فہم سے قاصر رہا اور نادانستہ ایک ایسے فرسودہ اور سست عناصر فلسفہ حیات کے نشو ونما کا سبب بنا جس سے انسان کو نہ تو اپنی ذات میں کوئی بصیرت حاصل ہوتی ہے نہ خالقِ کائنات اور کائنات میں، اشاعرہ میں البتہ جن مفکرین کا دل و دماغ

نسبتاً تعمیری تھا۔ صحیح راستے پر گامزن تھے اور انہوں نے فلسفۂ عینیت کی بعض جدید ترین شکلوں کی داغ بیل بھی ڈالی۔ مگر اشعری تحریک کا مقصد بحیثیت مجموعی صرف یہ تھا کہ اسلامی معتقدات کی حمایت یونانی جدلیات کے حربوں سے کی جائے..... معتزلہ یہ نہیں سمجھتے کہ علم کی دنیا میں خواہ اس کا تعلق مذہب سے ہو یا سائنس سے فکر کیلئے یہ ممکن ہی نہیں کہ عالمِ محسوسات سے اپنا رشتہ کلیتاً منقطع کر لے۔

بایں ہمہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ غزالی کی دعوت میں ایک پیغمبرانہ شان پائی جاتی تھی۔ کچھ یہی حیثیت اٹھارویں صدی میں کانٹ کو جرمنی میں حائل ہوئی۔ لہٰذا ٹھیک کہا گیا ہے کہ کانٹ ہی کی ذات وہ سب سے بڑا عطیہ ہے جو خدا نے جرمنی کو عنایت کیا تقریباً یہی نتیجہ غزالی کے فلسفیانہ تشکک سے دنیائے اسلام کیلئے مرتب ہوا..... غزالی نے بھی اس بلند بانگ مگر بے روح عقلیت کا زور ہمیشہ کیلئے توڑ دیا..... لیکن کانٹ اور غزالی کے درمیان ایک بڑا اہم فرق ہے اور وہ ہے کہ کانٹ نے اپنے اصول وکلیات کا ساتھ دیتے ہوئے یہ تسلیم نہیں کیا کہ ذاتِ الٰہی کا ادراک ممکن ہے۔ برعکس اسکے غزالی نے فکرِ تحلیلی سے مایوس ہو کر صوفیانہ واردات کا رخ کیا اور یہ رائے قائم کی کہ ان کے اندر مذہب کا ایک مستقل سرمایہ موجود ہے..... امام غزالی نے حقیقت مِن حیثُ الکل کا مشاہدہ چونکہ صوفیانہ واردات میں کیا تھا اسلئے انہیں یقین ہو گیا تھا کہ فکر محدود بھی ہے اور نارسا بھی۔ لہٰذا انہیں فکر اور وجدان کے درمیان ایک خطِ فاصل کھینچنا پڑا"۔

امام غزالی کے تئیں اس طرح کی عقیدت اور حُسنِ ظن ظاہر کرنے والے اقبال ہمیشہ مسلم مفکرین کے لئے غزالی کی نظر قابل رشک سمجھتے رہے۔ وہ بھی یہی حسرت ظاہر کرتے ہوئے :

دِگر بہ مدرسہ ہا من نمے بینم دِل جُنید و نگاہِ غزالی و رازی

اور کبھی" ایک فلسفہ زدہ سیّد زادے کے نامؔ عنوان کی نظم میں فلسفے کی خامیاں

یوں طشت از بام کرتے ہوئے سے

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا — زناریٔ برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی — ہے اُس کا طِلسم سب خیالی
دنیا کی عشا ہو جس سے اِشراق — مومن کی اذان ندائے آفاق
شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز — سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
انجامِ خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفہ زندگی سے دوری
افکار کے نغمہ ہای بے صوت — ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت
دین مسلکِ زندگی کی تقویم — دین سرِّ محمدؐ و براہیمؑ
دِل در سخنِ محمدیؐ بند — اے پورِ علی زِبوُ علی چند؟
چون دیدۂ راہ بین نداری — قائدِ قرشی بہ از بخاری

اقبال اور حافظؔ شیرازی

اقبال سے بہت پہلے دُنیا نے حافظؔ شیرازی کو سر آنکھوں پر بٹھا رکھا تھا۔ اس عظیم صوفی شاعر کو نہ صرف سلوک و معرفت کا مرشد تسلیم کیا جاتا تھا بلکہ اُس کے کلام کو تقدس مآب قرار دے کر اُس سے فال نکالنے کی روش بھی عام ہوگئی تھی کیونکہ وہ صرف حافظِ کلام اللہ نہ تھے بلکہ مریدوں کی نظر میں وہ قرآنی اخلاقیات کا درس دینے کے ناطے بھی لِسان الغیب تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ ایک مثالی شاعر ہونے کا اعلان وہ خود بھی یہ کہہ کر کر چکے تھے کہ ؎

ندیدم خوشتر از شعرِ تو حافظؔ بقُرآنے کہ اندر سینہ داری

واقعاً شعرِ حافظ کا جادو سب کو مسحور کر چکا تھا اور کئی دیگر اسباب کے تحت روز افزوں تنزل کا شکار ہو گیا ہوا مسلم معاشرہ مشرق میں صوفیانہ شاعری کی افیون کھا کر کئی طرح کے منفی رجحانات کا شکار ہو گیا تھا۔ حکیم الامت علامہ اقبال کے حساس دِل سے یہ سب کچھ دیکھا نہ جا سکا اُن کی عقابی نظر کو صاف طور پر، ذہین طبقہ جو کسی معاشرہ کی روح کے مصداق ہوتا ہے حافظ کے شعری افکار سے بُری طرح متاثر دکھائی دیتا تھا۔ اقبال جو شاعری کو ''جُز ویست از پیغمبری'' کہہ کر یاد کرتے تھے اور جو شاعر کو ''دیدۂ بینائے قوم'' دیکھنے کے متمنی تھے وہ سوزِ عمل کو سُلانے والی افیون کو کیونکر تریاق قرار دے سکتے تھے۔ اسی پس منظر میں اقبال حافظ کی شاعری کے حاوی موضوع کو ''گوسفندیت'' کا نام دیتا ہے اور یونانی فلسفے کے زیرِ اثر پنپنے والی ہر شاعری کو افلاطونی اقدارِ فلسفہ سے مواقفت رکھنے کے باوجود مُضرِ اخلاق بلکہ باعثِ انحطاط قرار دیتا ہے چنانچہ اقبال اپنی پہلی فارسی

مثنوی اسرارِ خودی میں احتجاجاً پکار اٹھتا ہے کہ

الحذر از حافظِ صہبا گسار جامش از زہرِ اجل سرمایہ دار

یوں اقبال ڈنکے کی چوٹ حافظ کے کلام کی زیرین لہر ملی شعور کیلئے سم قاتل ہونے کا اعلان کرتے ہیں اور ان تاویل پسندوں کا تمسخر اڑاتے ہیں جو اپنی اپنی خانقاہوں میں نان وحلوا کی گرم بازاری قائم رکھنے کیلئے حافظ کی مئے دوسالہ کو بھی مئے معرفت قرار دیتے تھے اور حافظ کی صوفیانہ اصطلاحوں میں شامل ''محبوب چہاردہ سالہ'' کو بھی تصوف کے چودہ خانوادوں کے ساتھ ڈانڈے ملانے کیلئے گاؤتکیوں کے ساتھ ٹیک لگا کر پورا پورا دن بحث کرتے رہتے تھے۔ فکری سطح پر حافظ سے اتنا برہم دکھائی دینے والا اقبال فنی سطح پر حافظ کے مداحوں میں تھا۔ چنانچہ جب اسرار خودی کے ایسے اشعار :

بے نیاز از محفلِ حافظ گذر الحذر از گوسفندان الحذر

سُن کر خواجہ حسن نظامی، اکبر الہ آبادی اور مہاراجہ کرشن پرشاد جیسے لوگوں نے شدید ردعمل ظاہر کیا تو ۱۳ اپریل ۱۹۱۶ء کے روز اقبال نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے مہاراجہ کرشن پرشاد شاد کو ایک خط میں لکھا ''خواجہ حافظ کی شاعری کا میں معترف ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ایسا شاعر ایشیا میں آج تک پیدا نہیں ہوا۔ لیکن جس کیفیت کو وہ پڑھنے والوں کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ قوائے حیات کو کمزور و ناتواں کرنے والی ہے''۔

اب تک حافظ اور اقبال پر درجنوں سخن شناسوں نے اظہار خیال کیا ہے اور کئی کئی اہم نکتے اُبھارے ہیں لیکن ان سب میں ڈاکٹر یوسف حسین صاحب کو خاص امتیاز حاصل ہے جنہوں نے ''اُردو غزل'' اور ''غالب اور آہنگ غزل'' جیسی معرکۃ الآرا تصانیف کے بعد سوا چار سو صفحات پر مشتمل ''حافظ اور اقبال'' عنوان سے بھی ایک

شاندار کتاب شایع کی ہے اور اس کے دیباچے میں ہی یہ انکشاف کیا ہے کہ ''بہت سے امور میں حافظ اور اقبال میں مماثلت ہے۔ اگر چہ ابتداء میں اقبال نے حافظ پر تنقید کی تھی لیکن بعد میں اس نے محسوس کیا کہ اپنی مقصدیت کو موثر بنانے کیلئے حافظ کا پیرایۂ بیان اختیار کرنا ضروری ہے چنانچہ اس نے حافظ کے طرز و اسلوب کا شعوری طور پر تتبع کیا اور بعض اوقات جیسا کہ اس نے خود کہا ہے ایسا محسوس ہوا جیسے حافظ کی روح اس میں حلول کر آئی ہو''۔

پوری عمر شاعری میں کُھل کر حافظ کی مدح کرنے میں جو چیز اقبال کو آڑے آئی تھی وہ افکارِ حافظ سے اس کا اپنا ذہنی تحفظ تھا۔ ورنہ جس قرآن حکیم کو اقبال اپنا محرکِ اعلیٰ تصور کرتا تھا وہی قرآن حافظ سے کبھی اعلیٰ انسان دوستی کے ایسے اشعار کہلواتا تھا کہ

مباش در پے آزار و ہر چہ خواہی کُن کہ در شریعتِ ما غیر ازیں گناہی نیست

اور کبھی ایسے اشعار

آسائشِ دو گیتی تفسیرِ این دو حرف است با دوستان مروّت با دشمناں مدارا

اقبال جس مولانا رومی کو خاص شاعرانہ مفاہیم کے حوالے سے مرشدِ رومی قرار دیتے ہیں حافظ اپنے پیشرو اسی مولانا رومی کی مثنوی کو یہ کہہ کر اپنا خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

مثنویَ مولویُ معنوی ... ہست قرآن در زبانِ پہلوی

ان دو تخلیقی سرچشموں کی قدرِ مُشترک کے علاوہ جو باتیں سرزمینِ مشرق کے ان دو عظیم شاعروں میں مماثلت رکھتی ہیں اُن کی نشاندہی مختصراً اِن چند جملوں میں کی جا سکتی ہے کہ علم و فضل کے لحاظ سے جتنی مماثلت ان میں پائی جاتی ہے وہ ان دونوں کو رومی کے قریب پہنچاتی ہے۔ اول الذکر کو شمس العلماء کی حیثیت سے اور بعد الذکر کو علامہ اور حکیم الامت کی حیثیت سے۔ ان دونوں کی زندگی کی ابتداء درس و تدریس سے ہوئی

تھی لیکن آخر میں وہ دونوں مدرسہ اور خانقاہ سے بیزار ہو گئے تھے۔ ایمان وایقان کے اعتبار سے دونوں میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں اسلامی توحید کے قائل اور وحدت الوجود کے منکر نظر آتے ہیں۔ دونوں آزادیٔ روح کے مقصد میں متحد ہیں۔ البتہ بقول پروفیسر نذیر احمد جہاں اقبال عشق کی قوتِ محرکہ سے انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں وہاں حافظ کے عشق کا حاصل نشاط وسرمستی ہے۔ ان دونوں کی شاعری میں دل کو وجدانی ادراک کا مرکز قرار دیا گیا ہے گویا دونوں کی نظر میں دل ہی آئینہ جمالِ الٰہی کا پرتو ہے انسانی عظمت کے بارے میں دونوں شاعر متحد الخیال ہیں اور دونوں نے فقر واستغنا کو سراہا ہے۔ دونوں کے نزدیک توکل اور قناعت کا مقصد استغنا ہے، سچی قلندری اور درویشی ان دونوں عظیم شاعروں کی سیرت میں رچی بسی تھی یہی وجہ ہے کہ ریاکار زاہدوں، مکار مُلّاؤں اور دُنیا پرست صوفیوں کی پردہ دری کرنے میں یہ دونوں مولانا رومی کے دو خاص شاگرد ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان کے الفاظ میں حافظ اور اقبال دونوں کی حِس اور ادراک میں وسعت اور گہرائی ہے۔ حافظ کے جمالیاتی اخلاص اور اقبال کے مقصدی اخلاص میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ دونوں کو یہ احساس تھا کہ غم اور مسرت زندگی میں اُسی طرح ملے جُلے ہیں۔ جیسے خیر وشر، ان سے مفر ممکن نہیں۔ حافظ عملی اِنسان کی ضد ہے وہ اخلاقیات کا مدعی ہے اور نہ اجتماعیت کا' وہ ساحر ہے مصلح نہیں اقبال ساحر بھی ہے اور مصلح بھی۔ اقبال کے یہاں دعوتِ سعی وعمل کا جذبہ شدت سے کارفرما ہے جبکہ بلبلِ شیراز حافظ کے یہاں یہ عنصر دبا دبا سا ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کا امتیازِ سخن سنجی غلاموں کی ہزار سالہ دعاؤں کا ثمرہ معلوم ہوتی ہے۔ خود اقبال کے الفاظ میں

اِسی اقبالؔ کی میں جستجو کرتا رہا برسوں بڑی مدت کے بعد آخر وہ شاہین زیرِ دام آیا

●●●

اقبال اور شاہِ ہمدانؒ

اس مقالے کو دو حصوں میں پیش کرنا زیادہ موزون رہے گا۔

۱۔جاوید نامہ میں ذکرِ شاہ ہمدان کا سیاق و سباق

جو تہذیب آشنا ادیب اور دانشور حضرت امیر کبیر شاہ ہمدان میر سید علی ہمدانیؒ کو خطۂ کشمیر کے خاص محسن اور معمار کی حیثیت سے پہچانتے ہیں ان میں مادر کشمیر کے مایہ ناز فرزند علامہ اقبال کو کئی لحاظ سے ایک امتیازی مقام حاصل ہے یوں تو کشمیر کے فارسی گو متعدد شاعروں میں حضرت شیخ یعقوب صرفی قدس سرہ اور خواجہ حبیب اللہ نوشہریؒ جیسے قریب العصر عقیدت مندوں نے بھی حضرت امیر کبیرؒ کی عہد ساز شخصیت کا ہمہ گیر تعارف پیش کرنے کی اچھی کوشش کی ہے۔ بلکہ حضرت صرفی نے تو مسلک الاخیار نام کی اپنی وہ منظوم تصنیف سید موصوف کا ذکرِ خیر کرنے کیلئے وقف کردی ہے جس میں ان کے عارفِ اسرار نہانی اور علیؑ ثانی ہونے کا اعتراف ایسے اشعار میں کیا گیا ہے :

ے

این ہمدانی ہمہ دانی دہد !۔ ! معرفتِ سِرِ نہانی دِہد !۔ !

و ھُو امام العُرفا بالیقین !۔ ! زُبدۂ اولادِ شہِ مُرسلینؐ !۔ !

گر چہ دو صد راہ سوے مطلبست راہِ امامِ ہمدان اقرب است

ہمچو علیؑ دانشِ ربانئش ۔ ! زان لقب آمد علیِ ثانیش ۔ !

جبی نے بھی اسی طرح کے ذاتی بیانیہ اظہار سے کام لے کر کہا ہے:—

من بندۂ شاہِ ہمدانی ہستم پروردہ ٔ آنِ علیِ ثانی ہستم
ہر کس کہ محبتِ اوشدہ از دل و جان از صدقِ دلش محبتِ جانی ہستم

ان دو پیشرو کشمیری شاعروں سے تین سو سال سے زیادہ بعدِ زمانی اور بیرونِ کشمیر رہائش پذیر ہونے کے ناطے بعدِ مکانی رکھنے کے باوجود میر سیّد علی ہمدانی کے تئیں علامہ اقبالؔ کا خراجِ عقیدت ان سے کہیں زیادہ جامع اور زوردار ہے اگر چہ یہ بات بھی پُرسیدنی ہے کہ صرفیؔ اور حبیؔ جیسے بزرگ صوفیاء اور شعراء نے اس بڑی حقیقت کو زیادہ واشگاف الفاظ میں بیان کیوں نہ کیا کہ خطۂ کشمیر کی تاریخ کا سب سے بڑا روحانی، سماجی اور ثقافتی انقلاب سیّد موصوف ہی کا پیدا کردہ تھا تاہم صوفیانہ شاعری کے رمزیہ اظہار کی عام روشِ نظر میں لاکر اس سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ پھر بھی اگر یہ دیکھنا مقصود ہو کہ علامہ اقبالؔ اپنے تاثر کو ان بزرگ پیشروؤں کے تاثرات سے زیادہ اثر آفرین اور کثیر الجہات کیوں بنا سکے ہیں تو اس سلسلے میں ایک گونہ تقابل کا موقعہ آپ حضرات کو میسّر کرنے کیلئے میں صرف حضرتِ صرفیؒ کے اُس اظہارِ عقیدت سے چند شعر پیش کرتا ہوں۔ جو آپ نے اپنی مشہور تصنیف مغازی النبیؐ میں زیرِ عنوان ''روحِ علی ثانی امیر کبیر سید علی ہمدانی قدس سرہ'' درج کیے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

مرا پیر، سیّد علیِ ولیؒ زِآلِ کرامِ نبیؐ و علیؓ
مزارش بختلان و مولد عراق ولے مسندش برترازنہ رواق
شہنشاہِ ملکِ ولایت ہمو مہِ آسمانِ ہدایت ہم او
کفش بحرِ امواجِ جودو ازان ہر انگشتِ اوجوئبارِ روان
دِلش بحرِعرفان و دریائے فیض زموجش بساحل گہرہائے فیض
نمیس اگر بگذرد در سراب سراب آنچناں گردوازوے پرآب
کہ باوسعتِ بحرِ عمان بود ولے آب او آبِ حیوان بود

بیابد اگر مردہ زان آبِ نم　　شود زندہ و زندگی بخش ہم
کمالاتِ دین دررہِ پیرِ ماست　　چہ پیر یکہ او افضلِ اولیاست

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں حضرت شاہ ہمدان کے روحانی کمالات کا احاطہ کرنے کے لئے جن خاص ترکیبات اور تشبیہات کو وضع کر کے استعمال میں لایا گیا ہے ان کی معنویت ادبی روایات کے اعتبار سے مسلم ہے مثلاً یہ کہ حضرت شاہِ ہمدان اصل میں ملکِ ولایت کے شہنشاہ ہیں وہ ہدایت کے آسمان پر اپنے دور میں چودہویں کے چاند کی طرح چمکتے ہیں ان کی ہتھیلی سے سخاوت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا دریا نکلتا ہے۔ جب کہ ان کا دِل بجائے خود معرفت کا ایک سمندر ہے سمندر بھی ایسا جو اپنی بخشش کے موتی ساحلوں پر دور دور تک بکھیرتا ہے اگر آپ کے بحرِ عرفان کی کوئی نہر آج بھی کسی فریبِ نظر بنے ہوئے سراب تک پہنچا دی جائے تو اس کی تقدیر اس حد تک بدل سکتی ہے کہ وہ سراب دیکھتے ہی دیکھتے بحرِ عمان جیسی وُسعت پالے گا بلکہ بحرِ عمان کے پانی کے بدلے وہ آبِ حیات ساحلوں کو بھی سرمدی تازگی بخشنے کا باعث　　بن سکے گا۔ یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہے کہ امیرِ کبیر جیسا نامِ نامی رکھنے والا ہمارا پیرِ کامل دین کے راستے میں ایسے کمالات بروئے کار لا سکا ہے، جنہوں نے آپ کو افضل الاولیاء اور امتیازی فضیلت کا دوستِ خدا بنا دیا ہے۔ علامہ صرفی نے یہ سب کچھ کہنے کے باوصف معاشرۂ کشمیر کے حوالے سے کچھ نہیں کہا ہے جب کہ علامہ اقبال نے اپنے خراج عقیدت میں اسی پہلو کو خاص ڈھنگ سے اُجاگر کر کے اس حقیقت کو زیادہ قابلِ فہم بنا دیا ہے کہ کئی صدیوں تک شرک وظلمت اور کفر و جہالت میں مبتلا رہے ہوئے کشمیر کو چودہویں صدی عیسوی کے نصف دوئیم میں یہاں تشریف لانے والے اور چند روزہ قیام سے نوازنے والے حضرتِ امیرِ کبیر نے اپنی روحانی بصیرت، حکمت عملی اور دور اندیشی سے مختصر ترین وقت میں وہ ہمہ گیر انقلاب یہاں پر برپا کر دیا تھا۔ جس کو تاریخ کشمیر میں واقعاً سب سے

بڑے روحانی، ثقافتی اور سماجی انقلاب کا درجہ حاصل ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے آبائی وطن کے اسی عظیم انقلاب کے حوالے سے حضرت شاہ ہمدان کے ذکرِ خیر کے لئے خاص الخاص ترکیبات وضع کر لی ہیں بلکہ موقع ومحل کے اعتبار سے بھی اپنی خاص کتاب جاوید نامہ میں اپنے روحانی سفر کے سب سے اونچے اور خاص مقام پر پہنچ کر حضرتِ شاہِ ہمدان کو دکھانے کا اہتمام کر لیا گیا ہے پھر تیسری خاص بات یہ کہ اپنے مرشد مولانا رومی کے اس مشورے کی صحیح ڈھنگ سے پذیرائی کرنے کے بعد :

خوشتر آن باشد کہ سرِ دلبران گفتہ آید در حدیثِ دیگران

علامہ اقبال نے حضرتِ امیرِ کبیرؒ کی کشمیر نواز کاروائی کا بھرپور تعارف کرانے کیلئے عالمِ بالا میں غنی کشمیری کی خاص روح کو وہ کہتے ہوئے دکھایا ہے جو

''سیّد السادات سالارِ عجم''

جیسی فکر انگیز ترکیبوں کے حامل مصرعے کے پس وپیش اور خاص تناظر میں اپنی معنویت عہدِ حاضر کیلئے بھی بالکل روشن کر دیتا ہے۔ علامہ اقبال کے ''در حدیثِ دیگران'' پیش کئے گئے مشہور ومعروف خراجِ عقیدت کا متن پیش کرنے سے پہلے اس کے پس وپیش والے تناظرات پر توجہ کرنے کی ضرورت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پر صفِ قارئین میں شامل ایسے حضرات کیلئے جنہیں خود جاوید نامہ پڑھنے کا موقع اور یہ سوچنے کا موقعہ نہ ملا ہو کہ ایک ملّی شاعر کی حیثیت سے علامہ اقبال نے بھی حکیم سنائی، مولانا رومی، علمدارِ کشمیر اور مولانا حالی کی طرح جوہرِ شاعری خصوصاً آدم گری اور کردار سازی کیلئے (اللہ کی طرف سے) خاص انعام اور امانت کے طور پر ودیعت کیا گیا وسیلہ اظہار گردانا ہے۔ پھر اس کے فطری فریضوں اور تقاضوں سے عہد برآ ہونے کی جو کوشش کی ہے۔ اسی کا معراج آپ کا جاوید نامہ ہے شاعر نے کئی ہزار اشعار پر مشتمل اس مثنوی طرز کی نظم کو ایک نیم تمثیلی روحانی سفر کی شکل میں ترتیب دیا ہے اور

اپنے آپکوزندہ رود نام کے تحت ایک بنیادی راوی بنا کر مرشد مولانا رومی کی ہمراہی میں آسمانوں کی سیر کرتے دکھایا ہے۔ ترتیب کی رو سے داستانِ سفر کا خلاصہ یہ ہے کہ نیم بیداری کے عالم میں اپنے قفسِ عنصری سے نکل پڑنے کے بعد زندہ رود فوراً ہی فلکِ قمر یعنی چاند والے پہلے آسمان پر پہنچ جاتا ہے، جہاں وہ طاسینِ گوتم، طاسینِ مسیحاؑ اور طاسینِ محمدؐ نام کے خاص پڑاؤ طے کرتے ہوئے کئی پراسرار مناظر دیکھنے کے بعد آگے بڑھتا ہے۔ پھر فلکِ عطارد یعنی دوسرے آسمان پر وہ امتِ مسلمہ کے حق میں اپنی دنیائی زندگی کے دوران چند انقلابی اقدام کرنے والے سیّد جمال الدین افغانیؒ اور سعید حلیم پاشاؒ جیسے پیشروں کی روحوں سے ملاقی ہوتا ہے۔ مولانا رومی کی موجودگی میں انہی دو بزرگوں کی روحیں زندہ رود کو اُن عالمگیر طاغوتی سازشوں سے باخبر کرتی ہیں جو افرنگیوں کے ذریعے دین اور وطن کے نام پر برپا کئے جانے والے فتنوں کی آڑ میں ساری کی ساری مغربی طاقتیں انجام دے رہی ہیں۔ کئی معاصر واقعات کا حوالہ دے کر ان کی نشاندہی کی جاتی ہے پھر شدید پریشانی کی لپیٹ میں آیا ہوا زندہ رود مرشد رومی سے ان سازشوں کا توڑ کرنے کی صورت دریافت کرتا ہے تو مولانا رومی بڑی ہی مرشدانہ شفقت سے زندہ رود کو قرآنی تعلیمات کی بنیاد پر تعمیر ہو سکنے والی ایک نئی امید افزاء دنیا کا نقشہ دکھا کر اس کو عالمِ قرآنی سے یاد کرتا ہے اور اسکی بنیاد ان چار محکمات پر قائم ہونا ممکن العمل دِکھاتا ہے۔

۱۔ خلافتِ آدم کے تصور کا احیاء

۲۔ حکومت الٰہی کے تحت اللہ کے قانون کا بلا امتیاز نفاذ

۳۔ الارضُ للہِ عقیدہ کے تحت ایک ملّت پرور بیت المال کا قیام اور

۴۔ حکمت خیرِ کثیر جیسے فرمانِ ایزدی کے تحت علم و حکمت میں دوسری قوموں سے آگے بڑھنے کی سعی۔

اِس قدر روحانی روشنی حاصل کر لینے کے بعد زندہ رود اگلے آسمانوں یعنی فلکِ زہرہ، فلکِ مریخ، فلکِ مشتری، فلکِ زحل اور آنسوئے افلاک سے گذرتے ہوئے ایسے ہی سینکڑوں نکتوں کے موتی دامنِ دل میں سمیٹ کر مرشد کے ہمراہ جنت الفردوس کی رحمت بار اور ضیا بار فضاؤں میں داخل ہو جاتا ہے وہاں اس کی نظر سب سے پہلے بُقعۂ نور بنائے گئے ایسے تین روح پرور محلوں پر پڑتی ہے۔ جن کو قرآن اور شمشیر کی اہمیت پر فدا ہونے والی پنجاب کی شہزادی شرف النساءؒ دین اور ملّت کا شعور کشمیریوں کو بخشنے والے روحانی حکمران شاہِ ہمدان اور غیرت و استغناء کے حقیقی بادشاہ غنی کشمیری کیلئے وقف کیا گیا ہے۔ مولانا رومی بقعۂ نور بنے ہوئے پہلے عالیشان روحانی محل کو ''قصرِ شرف النساء'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اور اپنے مرید زندہ رود سے کہتا ہے کہ یہ نورانی بُقعہ سرزمین پنجاب سے تعلق رکھنے والی اُس دخترِ ملت کیلئے بنا ہوا ہے۔ جو پنجاب کے حاکم عبدالصمد کی شرف النساء نامی انتہائی دین شناس، غیر تمند اور جرأت مند بیٹی تھی اور جو ساری عمر قرآنِ پاک اور شمشیرِ آبدار کی شیدائی اس واضح نظریئے کے ساتھ بنی رہی کہ ناموسِ زن اور ناموسِ دین کے لئے ان سے بہتر کوئی چیز نہیں اور یہ کہ ان دو چیزوں کو ہاتھ سے چھوڑ دینے کے بعد ہی کسی مسلم بستی کو زوال کے دن دیکھنا پڑتے ہیں۔ مولانا مزید کہتے ہیں کہ اس دیندار بیٹی پر ان دو چیزوں کو ہمہ وقت اپنے پاس رکھنے کی اہمیت اس قدر روشن تھی کہ ناموسِ ملّت پر موت آنے کی تمنا کرتے ہوئے اس نے اپنی ماں سے یہ وصیت کی کہ میری قبر پر میری شمشیر اور قرآن کو موجود رکھنے کا اہتمام کر کے میرے مرغوب پیغامِ عمل کو تقویت بہم پہنچانا، البتہ اور کوئی چیز وہاں نہ رکھنا جو میری قبر کو بُت بنا دے۔ اپنی ماں سے شرف النساء کن الفاظ میں ہم کلام ہوتی ہے اس کا عکس ان اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے۔

گفت اگر از راہِ دین داری خبر — سوی این شمشیر و این قرآن نگر
این دوقوت حافظِ یک دیگراند — کائنات و زندگی را محور اند
وقتِ رخصت با تو دادم این سخن — تیغ وقرآن را جُدا ازمن مہ کنُ
دل بہ آن حرفے کہ مے گویم بِنہ — قبرِ من بے گنبد وقندیل بہ
مومنان را تیغ با قرآن بس است — تربتِ مارا ہمیں سامان بس است

جاوید نامہ کا شاعر جہاں مولانا رومی کی زبانی بلکہ شرف النساء کی زبانی اس حقیقت کو دوٹوک الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ حفظِ ناموس کیلئے ایک مومن کی ترجیحی جائداد قرآنِ حکیم کے بعد شمشیر اور اس کی ارتقاء پذیر شکل میں ایجاد ہو گئے ہوئے مناسب اسلحہ سے بہتر اور کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی وہاں وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ مومن کے ہاتھ میں ہی اسلحے کے مناسب اور منصفانہ استعمال کی توقع کی جاسکتی ہے۔ یہ کہنے کے بعد ملت کے دانشوروں اور معماروں کو اس المیئے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ ایک عرصے تک حسبِ وصیت شرف النساء کی قبر پر شمشیر اور قرآن موجود رہے جو اہل پنجاب کو دعوتِ فکر دیتا رہے لیکن اس کی وصیت نے وہاں کے مسلمانوں سے بے اعتنائی پائی البتہ سکھوں سے داد تحسین پائی۔ چنانچہ انہوں نے نہ صرف آیۃ الکرسی کو گرنتھ صاحب کی روح بنا کر ایک سخت جان اور محنتی قوم بننے کی کوشش جاری رکھی بلکہ تیغ کو عملاً اپنی کمر سے لٹکانے کا اقدام بھی کیا۔ اس کڑوی حقیقت کی طرف ہمیں یوں متوجہ کیا گیا ہے۔

عمر ہادرزیر این زرین قباب — بر مزارش بود شمشیر و کتاب
خالصہ شمشیر و قرآن رابرد — اندران کشور مسلمانی بمرد

آخری مصرعے پر یعنی اندران کشور مسلمانی بمرد'' پر یہ بات ذہن میں رکھ کر غور کیجئے کہ یہ شاعرانہ پیشگوئی صرف ۱۵ سال بعد (۱۹۴۷ کے دوران) پنجاب میں رونما ہو گئے مسلمانوں کے قتل عام کی صورت میں ایک تازیانۂ عبرت لگا کر ہم سے اس

بات کا اعتراف کراتی ہے کہ ''قولِ مردان جان دارد'' اور یہ بھی کہ ایک دیدہ ور ملی شاعر کی بات کو از روئے غفلت نظر انداز تو کیا جا سکتا ہے لیکن پھر اس غفلت کی بڑی قیمت چکا کر خود فراموشی کا خمیازہ لازماً اٹھانا پڑتا ہے۔ بہر حال شاعر کے ہم عصر پنجاب کی اسی حالت زار کے پس منظر میں ہمسایہ بستی کشمیر کی پستی کے چہرے سے پردہ ہٹانے کے لئے دستِ حضرت امیر کبیر کو حرکت میں دکھایا جاتا ہے۔ چنانچہ جاوید نامہ کا اگلا عنوان یہ بنتا ہے

''زیارتِ امیر کبیر حضرت سیّد علی ہمدانیؒ و مُلا طاہر غنی کشمیری''

اشعار پر اظہارِ خیال کرنے سے پہلے ان کا متن من وعن پیش کرتا ہوں۔ جو اس طرح سے ترتیب دیئے گئے ہیں۔

حرفِ رومی دردلم سوزے فگند　　آہ پنجاب آن زمینِ ارجمند
ازتپِ یاراں تپیدم دربہشت　　کہنہ غم ہارا خریدم در بہشت
تادران گلشن صدائے درد مند　　ازکنارِ حوضِ کوثر شد بلند

''جمع کردم مشتِ خاشاکے کہ سوزم خویش را
گُل گمان دارد کہ بندم آشیاں در گلستان''

گفت رومی آنچہ مے آید نگر　　دل مدہ باآنچہ بگذشت اے پسر
شاعرِ رنگین نواطاہر غنی　　فقرِ او باطن غنی ظاہر غنی
نغمۂ مے خواند آن مستِ مدام　　در حضورِ سیّدِ والا مقام
سیّد السادات، سالارِ عجم　　دست اومعمارِ تقدیرِ امم
تاغزالی درسِ اللہ ھُو گرفت　　ذِکر وفکر از دو دمانِ او گرفت
سیّد آنِ کشورِ مینو نظیر　　میر و درویش وسلاطین رامشیر
خطہ را آن شاہ دریا آستین　　داد علم وصنعت و تہذیب ودین

آفرید آن مرد ، ایرانِ صغیر باہنر ہائے غریب و دل پذیر
یک نگاہِ او کُشاید صد گرِہ
خیز و تیرش رابدل راہے بدہ

ان مدحیہ اور توصیفی اشعار کے بعد جاوید نامہ کا جو بہت ہی غور طلب دفترِ اسرار کھلتا ہے اس کا عنوان ہے "درحضورِ شاہ ھمدانی" یہ دفتر اصل میں دینی غیرت اور ملّی شعور کی آبیاری کرنے والے ۹۸ بصیرت افروز اشعار پر مشتمل ایک مکالمہ ہے۔ جو ملّی شاعر زندہ رود اور ملّی معمار شاہ ہمدان کے درمیان حضرت رومی کی موجودگی میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ زندہ رود کے حُسنِ اِستفسار اور شاہِ ہمدان کے حُسن تبصرہ کی آڑ میں جو تعمیر و احیاء کے نکات قرآن اور احادیث کی روشنی میں ابھارے گئے ہیں ان کا خلاصہ بھی اس توضیح میں سمایا نہیں جاسکتا ہے اس لئے مندرجہ بالا توصیفی شعروں کی چاندنی کو الفاظ کے بادلوں سے برآمد کرنے پر اکتفا کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

پس منظر میں بیان کی گئی پنجاب کی حالت زار سے متعلق روئیداد قصرِ شرف النساء کی طرز پر سُنانے کے بعد ملّی شاعر اپنے علامتی پیکر زندہ رود کو راوی بنا کر کہتا ہے کہ مولانا رومی کی پنجاب سے متعلق بیان کی گئی داستانِ غم نے میرے سینے میں ایک آگ لگا دی اور میں ایک عرصہ تک تکبیروں سے آباد رہی ہوئی اس زرخیز سرزمین میں اہلِ ایمان کے اجڑنے کی خبر سن کر تڑپ اٹھا۔ پنجاب کے جن دوستوں نے ملّی دردمندی میں ڈوبی ہوئی میری وارننگ کو نظر انداز کر کے میری حق گوئی کا تمسخر اڑایا تھا۔ ان کی غفلت شعار یٔ ہٹ دھرمی اور ملّت فروشی کی باتیں یاد کر کے میں جنت کی فضاؤں میں بھی قرار نہ پاسکا۔ ابھی میں اس درد و کرب میں کمی آجانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ایک تازہ صدمے نے مجھ پر حملے کر دیا۔ ہُوا یہ کہ ہمارے پڑوس میں واقع "ارضی بہشت" کشمیر سے وابستہ ایک بہت ہی دردمند آواز سنائی دی۔ مجھے ایسا لگا کہ یہ کوئی دردمند حوضِ کوثر کے کنارے

غنی کشمیری کے اس شعر کو گا رہا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے وطن کے نادیدنی اور ناگفتہ بہ خونین مناظر دیکھ کر جب میں نے اپنے آپ کو جلانے کا فیصلہ کر کے تھوڑی سی گھاس پھوس جمع کر لی تو مجھ بلبلِ وطن کی خودسوزی اور آشوب آگہی کو نہ سمجھ سکنے والے اور غافل پھولوں کی طرح ہنسنے والے ہموطنوں نے مجھ پر طعنوں کے ایسے تیر پھینکنے شروع کئے کہ دیکھو جی بلبل اپنا گھونسلہ بنانے میں کیسا مصروف اور سرگرم ہے۔ معاصر کج فہموں کی ستم ظریفی کو یوں نشاندہی میں لانے کے بعد زندہ رود کہتا ہے کہ مشفق رومی میرے اضطراب کی کیفیت کو فوراً بھانپ گئے اور مجھ سے کہنے لگے، بیٹے گذرے ہوئے حادثات کا ماتم حد سے زیادہ نہ منا۔ ان حادثات سے سبق سیکھ کر آیندہ را احتیاط کے مصداق تمہیں اب درپیش خطرات کی فکر کرنی چاہئے۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اتنے میں حوضِ کوثر کی جانب سے ایک رنگین اور دلکش آواز والا شاعر آتا دکھائی دیا۔ وہ کوئی اور نہیں بلکہ خود محمد طاہر غنی کشمیری تھا۔ جس نے اپنی ظاہری اور باطنی زندگی کو فقر و استغنا کیلئے وقف کر دیا تھا اس کے نزدیک آتے ہی ہمیں یہ پتہ چلا کہ وہ مستِ مدام روز آکر اس عظیم حضرت شاہ ہمدان کی خدمت میں ایک نغمہ پیش کرتا ہے جو سیّدِ والا مقام ہیں۔ جو سیّد السادات ہیں جو سالارِ عجم ہیں اور جن کا ہاتھ معمارِ تقدیرِ اُمم ہے

ان چار فارسی ترکیبوں میں شاہ ہمدان کی عہد ساز شخصیت کے جن امتیازی پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ امیر تیمور کے معاملے میں عقیدت مندوں کے دلوں پر حکومت کرنے کے ناطے امیر کبیر کہلائے جانے والے میر سیّد علی ہمدانی نے تیموری دربار سے وابستہ ہو جانے والے علماءِ سوء کی راہ اختیار نہ کر کے ان حقیقی سیّدوں کی عظیم روایت کو زندہ رکھا۔ جنہوں نے حق وصداقت کے لئے جان کی بازی لگا کر ہمیشہ آلِ نبی ہونے کی لاج رکھی ہے یوں تو ''سیّدِ والا مقام'' ترکیب میں اوپر دئے گئے علامہ صرفی کے پہلے شعر کی

صدائے بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔اوراس ترکیب پر غور کرنے سے سیّد موصوف کی خاندانی عظمت اور نجیب الطرفین ہونے کا وہ پہلو بھی فوراً ذہن میں آجاتا ہے۔جس کی رُو سے مریدانِ باصفا نے آپ کو حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالےٰ وجہہ سے اسم وعمل کی مناسبت رکھنے کے ناطے ''علی ثانی'' گردانا ہے۔

۲۔ سیّد السادات ترکیب عقیدتی اظہار کی وہ استعارتی صورت ہے جو تاریخی اعتبار سے ۱۳۷۹ء عیسوی مطابق ۷۷۴ ھجری میں تقریباً سات سو سادات پر مشتمل کارواں کے ساتھ آپ کے واردِ کشمیر ہونے سے براہِ راست تعلق رکھتی ہے۔ حالانکہ اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس کارواں میں شامل سب ہی لوگ حسب ونسب سیّد نہ تھے بلکہ ان میں مختلف صنعت گر اور پیشہ ور بھی تھے البتہ وہ سب سیّد موصوف کے تربیت یافتہ ہونے کے ناطے اپنے آپ کو ملت وقوم کی خدمت کے لئے وقف کرنے والے تھے۔ گویا سیّد القومِ خادِمہُم اور اِنَّ اکرمکُم عنداللہ اتقاکُم کی رُو سے وہ بھی اس عظیم انقلابی مشن کو آگے بڑھانے میں برابر کے حصہ دار تھے۔جس کے آپؒ سید السادات تھے۔

۳۔ سالارِ عجم آپ کئی معنوں میں تھے اول اس لحاظ سے کہ سیّد جمال الدین افغانیؒ کے ایک پیشرو کی حیثیت سے آپ نے بہت پہلے اس وقت کے مسلم ممالک پر مشتمل عالمِ اسلام کا تین بار پیدل سفر کر کے اتحادِ ملّی کی عملی کوشش کو آگے بڑھایا۔ بلکہ مسلم حکمرانوں کی رہنمائی کے لئے آپ نے ذخیرۃ الملوک جیسی اہم کتاب اور چہل اسرار جیسے اہم نکات بھی منصۂ شہود پر لائے۔ مزید برآں آپ نے کشمیر کے مشہور فاتح سلطان شہاب الدین اور دہلی کے حکمران فیروز تغلق میں جاری جنگ کو دو مسلم بھائیوں کی باہمی رنجش قرار دے کر ختم کرنے کا عملی اقدام بھی کیا اور شاہانِ وقت کے ہاں زبردست عقیدت کے مالک ہونے کے باوجود آپ نے کوئی اقتدار قبول نہ کر کے قوموں کی تقدیر بدلنے اور سنوارنے کا وہ رول ادا کیا۔جس نے ملّی شاعروں کے تجربے

میں اس بات کو نقش کر لیا ہے کہ

قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش　　جس نے نہ ڈھونڈھی سلطان کی درگاہ

حالانکہ یہ بات بالکل یقینی تھی کہ کشمیر کا جو سلطان قطب الدین (برادرِ شہاب الدین) حضرت شاہ ہمدان کے کہنے پر اپنی ایک چہیتی بیوی کو طلاق دینے پر فوراً آمادہ ہو گیا وہ ان کے کہنے پر اپنی سلطنت کا ایک حصہ بھی آپ کے قدموں پر نچھاور کر سکتا تھا۔ لیکن آپ نے یا آپ کے فرزند سیّد میر محمد ہمدانیؒ نے اپنے آپ کو دولت و حکومت کے حرص و ہوا سے دور رکھ کر تبلیغِ دین اور تفکرِ ملّی کے لئے وقف رکھا اور یوں شاعر کو یہ کہنے کا موقعہ میسر کر دیا کہ:۔

خوشا وہ قافلہ کہ جس کے امیر کی ہے متاع
تفکرِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند !

۴:۔ آپ کا ہاتھ معمارِ تقدیرِ امم یقیناً ان معنوں میں ہے کہ چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں کو قرآنی تعلیمات کی مضبوط رسی یعنی حبل اللہ کو عملاً تھامنے پر آمادہ کرنے کی مخلصانہ کوشش کر کے آپ نے ان کی بگڑی کو بنا دیا اور اس بات کا عملی ثبوت پیش کیا کہ۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ　　غالب و کار آفریں، کار کشا، کارساز

اِس اظہارِ عقیدت میں ضمناً حجۃ الاسلام امام محمد غزالیؒ کے ساداتِ ہمدانیہ کی فیض تربیت سے مستفید ہونے کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ قابلِ فہم ہے خصوصاً اس لحاظ سے کہ امام غزالیؒ نے فلسفے کو مضرِ مذہب قرار دے کر جو بڑا مجتہدانہ اقدام کیا ہے اس کی اساس دین کی عملی خدمت کرنے کے اسی جذبے اور عمل سے زندگی کو جنت یا جہنم بنا سکنے کے اسلامی نظریہ پر تھی جس نے وسطِ ایشیا کے علماء سے حدیث اور فقہ کی گرانقدر خدمت کرائی ہے۔

جاوید نامہ کے مندرجہ بالا اقتباس کے آخری چار شعروں میں ان ساری

نوازشوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو کشمیر کو شاہ ہمدان کی دین کا نام دے کر یاد کی جاسکتی ہیں۔ مُناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان چاروں شعروں کو الگ الگ لیں۔ پہلا شعر ہے۔

سیّدِ آن کشورِ منیو نظیر میر ودرویش وسلاطین رامشیر

اپنے تاریخی اور ثقافتی تناظر میں یہ بات مسلم ہے کہ حضرت شاہِ ہمدانؒ خطۂ کشمیر میں ہر طبقۂ خیال کے لئے یکساں رہبرانہ اور مشیرانہ حیثیت رکھتے تھے۔ مثلاً دینِ توحید اور بہتر ایرانی تہذیب سے کشمیر کو روشناس کرانے کے لئے جو نمائندہ قسم کے عالم وفاضل یہاں تشریف لائے ان کے تو آپ واقعاً میرِ کارواں تھے ہی۔ یہاں اپنے قیام سے جن لوگوں کو آپ سے اور آپ کے رفقاء سے فیضان پانا نصیب ہوا اُن میں بادشاہِ وقت اور اُسکے امیروں، وزیروں کے علاوہ یہاں کے فقرا اور صوفیا بھی شامل ہیں اور یوں واقعاً آپ ہی ساکنانِ خطۂ کشمیر کے دلوں پر حکومت کرنے والے حقیقی حکمران اور سیّد تھے۔

اگلا شعر آپ کی کشمیر نوازی کے بیشتر پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ تمام کشمیریوں کے اجتماعی لاشعور کی آئینہ داری کرنے کے علاوہ یہ شعر ان کی جانب سے اعترافِ احسان مندی کا آئینہ دار بھی ہے ان الفاظ میں کہ:۔

خطہ را آن شاہِ دریا آستین داد علم و صنعت وتہذیب ودین

علامہ اقبال کی وضع کردہ ترکیب ''شاہِ دریا آستین'' میں علامہ صرفی کے اس بیان کی صدائے بازگشت سیدھے سنائی دیتی ہے کہ ''کفش بحرِ امواجِ جودؔ'' اور ان دونوں مایۂ ناز فرزندانِ کشمیر کی مراد حضرت شاہِ ہمدان کی گوناگون کشمیر نوازیوں کا کھلے دل سے اعتراف کرنا ہے کیوں کہ آپ نے کشمیریوں کو واقعاً علم وصنعت اور تہذیب ودین کی نئی افقوں سے آشنا کر دیا۔ وہاں علم سے مراد عربی اور فارسی جیسی ترقی یافتہ زبانوں میں پیدا اور منتقل ہوگیا ہوا علم ہے، جس کی بدولت بہت سی ایشیائی، افریقی اور یورپی قومیں

جہالت سے نکلی ہیں۔ اور صنعت سے مراد وہ دست کاریاں اور کاری گریاں ہیں جن کی بدولت تر دماغ اور چر بدست کشمیریوں نے غلامی در غلامی کے تاریک دور میں بھی دوسروں سے اپنی ذہانت کا لوہا منوایا ہے ان میں سے بیشتر کی داغ بیل کشمیر میں حضرت شاہِ ہمدان کے ہمراہ آئے ہوئے ایرانی اور ترکستانی کاریگروں نے ڈالی تھی۔ البتہ کچھ کی بنیاد عہدِ بڈ شاہی کے دوران وارِدِ کشمیر ہونے والے اہل ہنر سے منسوب ہے۔ اگلا شعر کشمیر کی اس ہمہ گیر اور سب سے بڑی سماجی تبدیلی SOCIAL TRANSFORMATION کو براہ راست حضرتِ امیر کبیر کی دین قرار دیتا ہے۔ جس نے کشمیر کو دیکھتے ہی دیکھتے دین وعقیدہ، زبان وادب، خوردونوش، لباس و زیورات غرض رہن سہن کے سبھی معاملات میں ایرانِ ثانی یا ایرانِ صغیر بنا دیا۔ شعر یہ ہے

آفرید آن مرد ایرانِ صغیر باہنر ہائے غریب و دِلپذیر!

حضرت شاہِ ہمدان کے تئیں علامہ اقبال کے اس معروف اور مخصوص خراج عقیدت کا آخری شعر ہر لحاظ سے قابل توجہ ہے۔

کہا گیا ہے

یک نگاہِ او کُشاید صد گرِہ خیز وتیرش را بدل راہے بدہ

یہ وہی حکیم الامت شاعرِ مشرق ہے جو اس بات کا برملا اعلان کرتا ہے کہ

؎ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہاں پر نگاہِ شاہِ ہمدان کے اعجاز کو یہ کہہ کر بیان کیا گیا ہے کہ وہ نظر آن کی آن میں سینکڑوں گُتھیاں سلجھاتی ہے اِس کرامت کا تجربہ کشمیریوں کو بہت پہلے ہو چکا ہے اس خِطّے کی تعمیرِ نو کے لئے اٹھائے گئے آپ کے تقدیر ساز اقدامات کی معنویت آج بھی برابر قائم ہے قرآنِ کریم اور سنتِ رسول اکرمؐ پر مبنی آپکی تعلیمات آج بھی ہماری

معاشی، سیاسی اور سماجی گتھیوں کو آسانی سے سلجھا سکتی ہیں کیوں کہ آپ سنگتراشوں کو سنگ ہائے مزار بنانے کی اجازت دے کر شرک پرور منتروں پر غالب آجانے والی جہری ذکر کی اجازت دے کر نہ صرف اعلیٰ پایہ ماہرِ نفسیات اور صاحبِ بصیرت ہونے کا ثبوت پیش کر چکے ہیں بلکہ آپ ماہرِ دینیات کی حیثیت سے ہماری تمام روحانی بیماریوں کا علاج کر سکنے کا بھرپور ثبوت بھی پیش کر چکے ہیں اس لئے وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم پھر سے آپ کے ارشادات کو اپنے دلوں میں جگہ دیں اور اپنی بگڑی کو بنانے کی عملی سعی کریں وہی اس آخری مصرے کا تقاضا ہے

خیز و تیرش را بدلِ را ہے بدہ۔

شاہِ ہمدان اللہ والوں کی قلبی کیفیت کو خود اللہ سے مخاطب ہو کر یوں نشاندہی میں لاتے ہیں

اے گرفتارانِ عشقت فارغ از مال و منال
والہانِ حضرتت را از خود و جنت ملال
مفلسانِ کوے شوقت را غلامی کرد چرخ
سالکانِ راہِ وصلت را دوعالم پایمال

میں کلامِ اقبال میں ذکرِ شاہ ہمدان کے سیاق و سباق سے متعلق اپنے عزیز دوست پروفیسر غلام رسول ملک (صدر شعبہ انگریزی دانش گاہِ کشمیر) کے ایک پرمغز اور خوبصورت مقالہ کے ایک حصے کو اِس حصے کا اختتامیہ بنانا پسند کروں گا پروفیسر موصوف نے رُوحانی سطح پر علامہ اقبالؒ اور شاہِ ہمدانؒ کے درمیان وقوع پذیر ہو گئے ہوئے فکر انگیز سوال و جواب کو نہایت خوبصورتی سے پیش کیا ہے اس لئے میں از روئے پذیرائی اپنی طرف سے اس میں کوئی اضافہ نہ کرنا چاہوں گا۔ موصوف لکھتے ہیں:

''میر سیّد علی ہمدانیؒ کلامِ اقبال میں صرف ایک مرتبہ نمودار ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس اس زمرے کی دوسری شخصیات تاریخی علامتوں کی حیثیت سے بار بار وارد ہوتی ہیں۔ اس فرق کے باوجود دنیاے اقبال میں ان کا داخلہ کئی لحاظ سے بہت اہم ہے۔ شاہِ ہمدان سے ہماری ملاقات جاوید نامہ میں ہوتی ہے جو میرے خیال میں مجموعی طور پر اقبال کا سب سے بڑا شعری کارنامہ ہے۔ جاوید نامہ کے آسمانی سفر میں اقبال کی ملاقات بہت سے ایسے عظیم فرزندانِ انسانیت سے ہوتی ہے۔ جنھوں نے کسی نہ کسی طرح سے تاریخ کے دھارے کو متعین کیا ہے۔ شاہ ہمدان ایک ڈرامائی تناظر میں سلطان شہید ٹیپوؒ اور جمال الدین افغانیؒ جیسے ابطال کی معیت میں نمودار ہوتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے دائرۂ اثر کو وہ وسعت اور ان کے کارنامے کو وہ شہرت نصیب نہ ہو سکی جو سلطان شہید اور جمال الدین افغانی کا حصہ ہے تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قدر و قیمت کے اعتبار سے ان کا کارنامہ کچھ کم اہم ہے۔ تاریخ ہمیں بہت سے ایسے انقلابیوں کی مثالیں فراہم کرتی ہے جن کے کاناموں کی وسعت اگرچہ محدود ہے مگر جو برمحل اور موزون وقت پر پیش آنے اور اپنی شدت اور گہرائی کی بناء پر بالآخر زیادہ دور رس اثرات کے حامل ثابت ہوئے۔ شاہِ ہمدان ایسے ہی انقلابیوں میں شامل ہیں۔

ایک ایسے خدامست اور صاحبِ بصیرت مردِ کامل سے اسرارِ مرگ وحیات، حقیقتِ خیر وشر اور اقوامِ عالم کے اسبابِ عروج و زوال کے متعلق استفسار کس قدر موزون ہے۔ شاہ ہمدان کے حضور میں اقبال ایسے ہی امور کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ سب سے پہلا سوال خیر وشر کی عالمگیر اور دائمی رزم آرائی سے متعلق ہے۔ سوال یہ ہے کہ نظمِ عالم میں خیر

کے دوش بدوش شر کے وجود کا جواز کیا ہے۔

بندۂ کز خویشتن دارد خبر آفریند منفعت را از ضرر
بزم بادیواست آدم راوبال رزم با دیواست آدم راجمال

مطلب یہ ہے کہ ایک جدلیاتی کشمکش کے بغیر نہ تو خیر کی قوت ارتقاء پذیر ہوسکتی ہے اور نہ ہی انسان کے اندر پوشیدہ امکانات بروے کار آسکتے ہیں۔ اس لحاظ سے خیر کیساتھ ساتھ شر کا وجود ضروری ہے اور اگر چہ اقبال کا نقطہ نظر مانوی قرار نہیں دیا جا سکتا تاہم وہ شیطان کو اس اعتبار سے قابلِ قدر سمجھتے ہیں کہ اس کی عدم موجودگی میں خیر و شر کی رزم آرائی کا کوئی وجود نہ ہوتا۔ اس بارے میں ان کا نقطۂ نظر کسی حد تک ان قدیم مسلم صوفیا کے نقطۂ نظر سے ملتا جلتا ہے جو شیطان کو توحیدِ خالص کا پیرو ہونے کے باعث عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اقبال ابلیس کو توحید ہی کا نہیں بلکہ عزتِ نفس کا بھی نقیب سمجھتے ہیں۔

شاہ ہمدان سے اقبال کا دوسرا استفسار اس کشمکش کے متعلق ہے جو قوموں کے اندر ایک دوسرے کے اوپر برتری حاصل کرنے کیلئے برپا ہے اس سوال میں عروج و زوالِ امم کا سوال بھی مضمر ہے اقبال کشمیر کو ایک ایسی زوال پذیر قوم کی مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں جو مقامِ عروج و اقبال سے گر کر مظلومی و استحصال کے قعرِ مذلت میں پہنچ گئی ہے۔ یہ مثال اس لحاظ سے موزون ترین ہے کہ دونوں شاہ ہمدان اور اقبال کشمیر کے دردمند عاشق ہیں۔ اقبال نوحہ کرتے ہیں:

از غلامی جذبہ ہائے او بمرد
آتشے اندر رگِ تاکش فسرد

۱۸۴۶ء میں کشمیر کی مظلومی اور بے بسی اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب انگریزوں نے اس بدنصیب خطۂ زمین کو ڈوگرہ قبائلی سردار گلاب سنگھ کے ہاتھ ۷۵/لاکھ

روپے کی حقیر رقم اور چند سیاسی مراعات کے عوض فروخت کر دیا۔ انسانی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی بھی کسی قوم کی اس طرح سے تذلیل وتوہین نہیں کی گئی تھی۔ اقبال مظلوم و بے بس کشمیر کی روح کو غنی کشمیری کی زبانی اس طرح فریاد کراتے ہیں:

باد صبا اگر بہ جنیوا گذر کنی
حرفے زما بہ مجلسِ اقوام باز گوے
دہقان وکشت و باغ و خیاباں فروختند
قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند

عروج وزوالِ امم سے متعلق سوال کا جواب دیتے ہوئے شاہِ ہمدان انسان کی اصل ماہیت یعنی روحِ انسانی کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں اور اس امر پر زور دیتے ہیں کہ انسان کو اس بات کا ہمہ وقت خیال رکھنا چاہئے کہ یہ روحِ ملکوتی کہیں جسمِ ناسوت کے ہاتھوں فنا نہ ہونے پائے۔ جب تک ایک قوم کی روح زندہ و پائندہ رہتی ہے۔ وہ مقامِ عروج واقبال پر فائز رہتی ہے جبکہ جسم پرستی اسے خاک میں ملا کر رکھ دیتی ہے۔ روحانی طور پر مردہ اور جسم پرست اقوام ہی دوسروں کی دست نگر اور غلام بن جاتی ہے۔

باتو گویم رمزِ باریک اے پسر تن ہمہ خاک است و جاں والا گہر
جسم را از بہرِ جان باید گداخت پاک را از خاک می باید شناخت

یہ دورِ حاضر کے انسان کیلئے اقبال کا مرکزی پیغام ہے۔ جاوید نامہ کے اختتام پر وہ عصرِ حاضر کے مرض کی تشخیص اس طرح کرتے ہیں۔

ترسم ایں عصرے کہ تو زادی درآن
در بدن غرق است و کم داندز جان

جو لوگ روح کا تزکیہ اور اس کی پرورش و پرداخت کرتے ہیں انہیں ہمہ جہتی

فلاح نصیب ہوتی ہے وہ آزاد انسانوں کی زندگی گذارتے ہیں۔ وہ اللہ کے بغیر کسی کی بالادستی اور سرداری قبول نہیں کرتے اور جانتے ہیں کہ اطاعت کس کی کی جائے اور کس کی نہ کی جائے۔ چنانچہ شاہ ہمدان اقبال کے ایک اور سوال کے جواب میں، جس کا تعلق سیاسی اقتدار کی حقیقت و ماہیت سے ہے۔ فرماتے ہیں:

فاش گویم باتو اے والا مقام　　باج را جزُ بادوکس دادن حرام
یا اُولی الامرے کہ مِنکُم شانِ اوست　　آیۂ حق حجُت و برہانِ اوست
یا جوانمردے چو صر صر تند خیز　　شہر گیر و خویش باز اندر تیز
روزِ کین کِشور کُشا از قاہری　　روزِ صلح از شیوہ ہائے دلبری

کشمیریوں کے زوال وانحطاط کی اصل وجہ روح اور اس کے تقاضوں کی طرف ان کی مجرمانہ غفلت اور مادی اغراض و مقاصد میں ان کا بے پناہ انہماک ہے۔ ان کی روح بیدار ہو جائے تو وہ اپنا کھویا ہوا عروج واقبال پھر حاصل کر سکتے ہیں۔ کشمیری پھر زندہ ہونگے اس لئے کہ ان کے قلوب وارواح ابھی مکمل طور پر مردہ نہیں ہو چکے ہیں

دِل میانِ سینۂ شان مُردہ نیست
اخگر شان زیرِ یخ افسردہ نیست "

(سرودِ سحر آفرین ص ۶۵۔۶۹)

۱۱- شاہ ہمدانؒ کے شعری مجموعے

ایک مختصر تعارف

اکابرینِ اسلام نے جہاں ترویجِ قرآن سے تعلق رکھنے والے فنِ خطاطی کی اور تزئینِ مساجد سے تعلق رکھنے والے فنِ تعمیر کی خوب خوب داد دی ہے۔ وہاں واقعاً انہوں نے توحید ورسالت اور حقیقت ومعرفت کا نورِ بصیرت عام کرنے کے مقاصد سے تعلق رکھنے والے فنِ شعر کی بھی نہ صرف سراہنا اور حوصلہ افزائی کی ہے۔ بلکہ اُن میں سے بیشتر نے اپنی طبعِ روان اور اپنے رموز ونکات کو بروئے کار لاکر اُس فن کو چار چاند بھی لگائے ہیں۔ چنانچہ خلفائے راشدینؓ سے لیکر بعض ممتاز اور عہد ساز اولیائے کرام تک اس فن کو ہزاروں اشعارِ گہربار سے اتنا مالدار بنادیا گیا ہے کہ واقعاً ان میں سے بیشتر بزرگوں کو یہ کہنا غالبؔ سے پہلے زیب دیتا تھا کہ: ''شعر خود خواہش آن کرد کہ گردد فنِ ما'' چنانچہ فارسی میں جس عرفانی شاعری کی سنہری زنجیر حکیم سنائیؔ اور شیخ فریدالدین عطارؔ جیسے برگزیدہ شعراء کے بعد مولانا رومیؔ شیخ سعدی اور حافظ شیرازی کے ذریعے وسعت پذیر ہوکر خاتم الشعراء مولانا جامی تک پوری آب وتاب سے پہنچتی ہے اسی سلسلۃ الذہب کی جامی سے پہلی والی درخشندہ کڑی شاہ ہمدان علائیؔ علیہ الرحمہ کی عارفانہ شاعری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حضرت شاہ ہمدان کی قد آور انقلاب پرور اور کثیر التصانیف شخصیت کے دوسرے درخشندہ پہلوؤں کی تابانی میں اس متاعِ دلپذیر کی جانب اب تک وہ توجہ نہ دی جاسکی ہے جس کی یہ ہر لحاظ سے مستحق ہے۔

یہ بات کون نہیں جانتا کہ حضرت میر سیّد علی ہمدانیؒ کی عہد ساز اور کشمیر نواز شخصیت کئی منفرد رنگوں اور روشنیوں کے اِمتزاج سے عبارت ہے۔ لیکن دوسرے تمام رنگوں پر آپکے روحانی کارناموں کی روشنی غالب رہی ہے اور بیشتر تاریخوں اور تذکروں کے صفحات بھی اسی پہلو کے نذر ہو گئے ہیں جس کا اندازہ اُن کے اعزازی ناموں اور عقید تمندانہ القابوں سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو مختلف کارناموں کی مُناسبت سے آپ کو دئے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنی علمی بصیرت اور عرفانی قدر و منزلتکی رعایت سے آپ کا علی ثانی کہلایا جانا، معاصر مسلم حکمرانوں کے درمیان مفاہمت اور ملّی اخوت کا جذبہ بڑھانے والے وفودِ سادات کی سربراہی کرنے کی رعایت سے آپکا سید السادات کہلایا جانا' ہم عصر امیر تیمور کی فتوحات ظاہری کے مقابلے میں اسلامیانِ عالم کے دلوں کو فتح کرنے کے تعلق سے آپکا امیر کبیر کہلایا جانا' حاکم کشمیر سلطان قطب الدّین جیسے بادشاہوں کی روحانی تربیت کرنے کے ناطے آپ کا شاہ ہمدان کہلایا جانا' اسی طرح سے کشمیر میں حضرت بلبل شاہ ترکستانیؒ کے تبلیغی مشن کو کمالِ تدبر سے جاری رکھنے اور وسعت دینے کے ناطے یعنے خود شافعی مسلک پر کاربند ہو کر انکے حنفی مسلک کو جاری رکھنے اور خود کبیرویہ سلسلہ سے وابستہ ہونے کے بوصف انکے سہروردی سلسلہ کو تقویت بہم پہنچانے کے ناطے آپ کا "بانیٔ مسلمانی در کشمیر" کہلایا جانا' اربابِ عقلِ رسا کے دلوں میں آج بھی ایمان و عرفان کے ان گنت چراغ روشن کرتا ہے بلکہ ان کے لئے بہت سی ان کہی باتوں کو بھی فردوسِ گوش بناتا ہے۔ اس سلسلے میں آپکے تخلص علائی کا تعلق حضرت سید علاء الدولہ سمنانیؒ سے ہے جن کو عالمِ رویا میں دربار رسالت سے اِس ضمن میں ایک پیشگی اشارہ دیا گیا تھا۔ حضرتِ شاہِ ہمدان کے ایک قریب العصر تذکرہ نویس یعنے خلیفہ نورالدین جعفر بدخشی کے مرید ملا حیدر بدخشی نے اس اشاریئے کا ذکر منقبت الجواہر میں بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ اُس اِشارے پر غور کرنے سے فوراً یہ بات قابلِ فہم

بن جاتی ہے کہ جس طرح شیخ سعدی نے اتا بک ابوبکر سعد بن زنگی جیسے سرپرستسے اظہار ارادتمندی کے طور پر سعدی تخلص اختیار کیا تھا اسی طرح سے اپنے روحانی محسن اور مربی سے اظہارِ عقیدت مندی کے طور پر حضرتِ شاہ ہمدان نے علائی تخلص اختیار کیا ہے حضرتِ شاہ ہمدان کے یہاں شیخ سعدی کی روایتِ تخلص کا ہی احیاء نہیں ملتا۔ بلکہ انکی مسجع و مقفیٰ نثر اور والہانہ پن سے معمور نظم کا بھی یہاں ایک گونہ احیاء محسوس ہوتا ہے خیر آپکی مایہ ناز نثری تصنیف ذخیرۃ الملوک اور رسالۂ مناجات جیسی نثر سے یہاں پر صرفِ نظر کر کے فقط آپکے دستیاب نظم پاروں کی بات تک محدود رہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عام عقیدت مندانِ شاہ ہمدان اور قارئینِ حضرت علائی کی طرح ابتدا میں مجھے بھی یہ بات ذہن نشین ہوگئی تھی کہ حضرتِ شاہ ہمدان کے عارفانہ کلام سے مُراد چہل اسرار ہے اور بس۔ لیکن چہل اسرار کی تخلیق سے وابستہ جس کرامت کا گھر گھر چرچا ہے اس نے میرے ذوقِ تجسس کو تحقیق کے دوران ایک ایسی سعادت مندی سے ہمکنار کر دیا ہے جس پر میں اِترائے بغیر نہیں رہ سکتا، دستیاب شواہد کی رو سے واقعاً یہ سعادت مندی اِس بندۂ ناچیز سے پہلے کسی بھی محقق یا تذکرہ نویسکو نصیب نہ ہوسکی ہے میری مُراد حضرت شاہ ہمدان کا ایک ضخیم دیوانِ شعر ماضی قریب تک کشمیر میں موجود رہنے کا سراغ مل جانے سے ہے۔ بلکہ اس کے علاوہ حضرتِ شاہ ہمدان کی ایک مختصر مثنوی اور کئی نادر رسالوں تک بھی مجھے رسائی حاصل ہوگئی ہے۔ البتہ چونکہ اس مقالے کیلئے وقف کئے گئے وقت کی تنگدامانی کا احساس دامن گیر ہے اسلئے صرف چہل اسرار، دیوان علائی اور مثنوی مذکورہ سے متعلق چند باتیں عرض کرنے پر اکتفا کروں گا وہ بھی ان کے محاسن شعری کے بجائے انکے تحقیقی امور سے متعلق۔

چہل اسرار کی تخلیق سے وابستہ کرامت کا واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اپنے قیامِ کشمیر کے دوران حضرت شاہ ہمدان کو ماہِ رمضان کی ایک شام کے وقت اُن چالیس

مریدوں کی دلجوئی کرنے کی بات سُوجھی جنہوں نے بڑی عقیدت سے آپ کو اپنے یہاں لے جانے کی تمنا کی تھی۔ چنانچہ اُس روز افطار کے وقت چالیس مریدوں نے انفرادی سطح پر حضرت شاہ ہمدان کی بجسد تشریف آوری سے نہ صرف اپنے گھروں کو منور ہوتے دیکھا بلکہ آپ نے ہر ایک کو اپنی ایک ایک غزل بھی تحریر کر کے مرحمت فرمائی پھر جب اگلے روز ہر ایک نے اپنا غریب خانہ آپ کی آمد سے مشرف ہونے کی بات دوسروں کو سنائی اور ثبوت کے طور پر تبرکاً مرحمت ہوگئی ہوئی غزل پیش کر دی تو چالیس غزلوں پر مشتمل چہل اسرار نامی کتابچہ معرض وجود میں آ گیا۔ ایک مقامی مورخ عبد الوہاب شائیق نے چہل اسرار کے اس کراماتی شانِ نزول کو یوں قلمبند کیا ہے

؎ بافطار در چل محل ِچل غزل رقم کردہ آں سیّدِ بے بدل
بیک وقت در ِچل مقام آن امیر نوشتہ است آں ِچل غزل بے نظیر

لیکن اصل واقعہ کے چہرے سے کرامت کی دبیز چادر ہٹا کر دیکھیں تو اپنی درجنوں غزلوں میں سے خود منتخب فرمائی ہوئیں شاہ ہمدان کی ان چالیس غزلوں سے متعلق کئی باتیں سامنے آجاتی ہیں ایک یہ کہ بکثرت چھاپ ہوگئے ہوئے چہل اسرار کے مختلف نسخوں میں غزلوں اور اشعار کی تعداد مختلف ہونے کے علاوہ انکے مختلف متون سے واسطہ پڑتا ہے جو وقتاً فوقتاً اس میں تحریف یا کمی بیشی واقع ہونے کی غمازی کرتا ہے اس کے کئی نسخوں میں اکتالیس غزلیں اور کئی رباعیاں درج ملتی ہیں۔ ان رباعیوں کی تعداد بھی مختلف ہے جو بہر حال تخلیقات کے اعتبار سے چہل اسرار کو چالیس کے عدد سے تجاور کراتی ہیں۔ جو دوسری بات سامنے آجاتی ہے اس کو میں نے اپنے ذوق تجسس کو مہمیز دینے والی بات کہا ہے۔ حالانکہ اس طرف بہت کم لوگوں کا دھیان گیا ہے یعنی جو عظیم شخصیت اپنے تخلیقی جوہر کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ہی شام چالیس معیاری غزلیں تخلیق یا تحریر کر سکتی ہے اس کی قابلِ توجہ عمرِ شریف میں ایسی منظوم تخلیقات خاص

طور پر غزلیات اور رباعیات کا شمار کہاں تک پہنچ گیا ہوگا اس بات کا جواب ہمیں زمانہ کی دستبرد سے بچے ہوئے دیوانِ علائی کے اس حصے سے لینا ہوگا جس کا آخری صفحہ ۱۱۵۰ ھجری میں تحریر کئے گئے ترقیمے کے ساتھ میں آج آپکے سامنے پیش کر رہا ہوں یہ صفحہ ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے

''تمام شد دیوان حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانے بتاریخ ۱۷ رجمید الثانی ۱۱۵۰ھ'' درد وسوز میں ڈوبے ہوئے جو گیارہ شعر اس صفحے پر درج ہیں۔ ان کا تعلق ہیئت کے اعتبار سے رباعیات سے ہے ان میں سے ایک یہ ہے

ملک طلبش بہر مسلمان ندہند | منشورِ غمش بہر دل و جان ندہند
درمان طلبان زِ دردِ او محرومند | کین درد بطالبانِ درمان ندہند

یہ شعر بھی دیکھئے:۔

دردے کہ دل از عشق در آتش باشد | ہر قصہ کہ گوید ہمہ دلکش باشد

قصہ ہائے دلکش پر مبنی دیوان علائی کتنی غزلیات اور کتنی رباعیات پر مشتمل ہے اس کا اندازہ تب تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس دیوان کا ایک نسخہ وسط ایشیا یا کشمیر کے کتب خانوں سے برآمد ہو کر منظر عام پر نہیں آجاتا۔

محققین کیلئے یہاں پر اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر میں اور کشمیر سے باہر کئی اور لوگوں نے بھی حضرت شاہ ہمدان سے ملتے جلتے تخلص علائی اور علی کا استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ایسا دیوان بھی میری نظر سے گذرا ہے جو کسی علی ہمدانی بدخشانی سے منسوب ہے۔ پھر علائی شیرازی اور علائی کیکاکی کے اشعار بھی مغالطے کا سامان بہم کرتے ہیں۔ اور پھر حضرت علائی کا ایک کشمیری عقیدت مند اپنے اشعار میں علی اور علائی دونوں تخلص استعمال کر گیا ہے اس کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے۔

؎ اے علی گر آبروی دو جہاں سازی طلب
درمناقب گفتن شاہنشہِ ہمدان بکوش

جہاں تک حضرتِ شاہ ہمدان کی مثنوی کا تعلق ہے۔اس کو محققین نے رسالۂ اختیارات اور بعض نے اختیاراتِ امیر سے یہ نام موسوم کیا ہے۔ البتہ لُغت نامہ وہخدا میں ایسی ایک تصنیف کا پورا نام اختیارات النطق فی التصوف ظاہر کیا گیا ہے۔ میری نظر سے گذرے ہوئے نسخے کا نام براہ راست ''مثنوی اختیارات'' ہے یہ نسخہ مجھے مرحوم پروفیسر طیب شاہ صدیقی کے پرائیویٹ کتب خانے میں ملا تھا۔ساڑھے چار سو کے قریب اشعار پر مشتمل اس مثنوی کا موضوع تصوف ہے اسکے بیشتر اشعار میں حکیم سنائی اور شیخ سعدی کے محسوسات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔اس کے بعض اشعار پڑھکر اندازہ ہوجاتا ہے کہ حضرت شاہ ہمدان کے تئیں علامہ اقبالؒ کی عقیدت مستحکم بنانے اور سید الساوٗت سالار عجم جیسے الفاظ کی گل افشانی اس سے کرانے میں حضرت امیر کبیر کے دیگر روحانی کمالات کے علاوہ اس مثنوی اور دیگر تصنیفاتِ شاہِ ہمدان کا براہ راست دخل رہا ہے۔مثنوی کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے۔دیکھئے ان میں پندنامہ عطار کی کیسی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔

حمد بیحد آن خدائے پاک را کو خلافت داد مشتِ خاک را
آن خرد بخشے کہ آدم خاک اوست جزوکل برہان ذاتِ پاکِ اوست
آفتاب و روح راتاباں کند در گل آدم دلے پنہاں کند

اِن حمدیہ اشعار کے اختتام پر پہنچ کر شیخ سعدی کا یہ اظہار یاد آجاتا ہے

دریں ورطہ کشتی فروشد ہزار کہ پیدانہ شد تختۂ برکنار

اختتامیہ یہ ہے:۔

؎ در جمالش عقل و جان فرتوت شُد عقل حیران گشت و جان مبہوت شُد

درتگِ ایں بحرِ بے پایاں بسے　　غرقہ گشتند وبرون نامد کسے
زونشان جز بے نشانی کس نیافت　　چارۂ جز جانفشانی کس نیافت

اس کے بعد مثنوی اپنے نقطۂ عروج کی طرف آگے بڑھتی ہے اور شاعر ذات باری سے مخاطب ہوکر مناجات کے ایسے اشعار صفحۂ قرطاس پر لے آتا ہے۔

؎ اے خرد درراہ تو طفلے بشیر　　گم شُدہ در جستجویت عقل پیر
نے تو درعلم آیئ ونے دربیان　　نے زیان نے سودت ازسودوزیان
ہر کہ در کوئے تو دولت یار شد　　در تو گم گشت وزخود بیزار شد
عفو کن بے ہمتی ہائے مرا　　محوکن بی حرمتی ہائے مرا
یک نظر سوے دِل پرخونم آر　　درمیانِ این ہمہ بیرونم آر

اس مناجات کے بعد مثنوی اختیارات میں اپنے نفس سے اور سالکانِ راہ طریقت سے تخاطب اختیار کیا گیا ہے اور دلنشین اشعار کی بڑھتی ہوئی روانی کے ساتھ مثنوی اپنے خاتمے کو پہنچتی ہے

حضرت شاہ ہمدان کے عارفانہ کلام کی فکری اور فنی رعنائی بہر حال اب تک شاذ ہیچالیس غزلوں کے مختلف المتون چہل اسرار کے حوالے سے کُھل کر سامنے آسکی ہے۔ فکری سطح پر جہاں وحدۃ الوجودی فکر سے آپ کی دلچسپی ایسے اشعار ظاہر کرتے ہیں کہ

؎ اے آنکہ حدوث وقدمت اوست ہمہ　　سرمایۂ شادی وغمت اوست ہمہ
تو دیدہ نداری کہ سر خود نگری　　ورنہ زسرت تاقدمت اوست ہمہ

وہاں آپ کی فنی صلاحیت کا مظاہرہ ایسے اشعار سے ہوتا ہے

؎ از کنارِ خویش مَے یابم دمادم بوئے یار　　زان ہمے گیرم بہر دم خویشتن رادر کنار
؎ اہلِ دل بوئے ترا جنتِ اعلیٰ دانند　　پرتوِ نورِ ترا، نورِ تجلّی خوانند

اقبال اور غنی کشمیری

علامہ اقبال نے اپنے پیشرو شعراء میں سے چند سرکردہ فارسی شاعروں کے تئیں اپنی خاص عقیدت دو طرح سے پیش کی ہے۔ پہلی صورت میں ان کے ایسے اشعار پر تضمین لکھ کر جن میں اقبال اپنے فلسفۂ خودی' بے خودی اور اپنی مقصدیت سے متعلق کسی طرح کی مناسبت اور مطابقت محسوس کرتے ہیں۔ دوسری صورت میں ان کی شخصیات اور فکر و فن کی خصوصیات کو نشاندہی میں لانے کیلئے انہیں باضابطہ موضوعِ سخن بنا کر۔ البتہ ان میں بھی جن کے ساتھ اقبال کی خاص دلبستگی رہی ہے انہیں دونوں طرح کی عقیدت پیش کرنے میں شاعر مشرق کہلائے جانے والے علامہ محض مریدِ ہندی بنتے ہیں ایسے شعراء میں مولانا رومی اور مولانا جامی سرفہرست ہیں۔ اس کے بعد اقبال غنی کشمیری اور مرزا غالب جیسے پیشروؤں کے تئیں بھی دونوں طرح کا اظہارِ عقیدت کرتے ہیں بلکہ ان کے اشعار پر تضمین لکھنے کے علاوہ اُن کو کئی کئی بار موضوع سخن بناتے ہیں۔ فارسی شاعروں سے اپنی زیادہ مناسبتِ ذہنی دکھاتے ہوئے علامہ اقبال نے اپنی پہلی اُردو تصنیف بانگ درا میں جن درجن بھر شعراء کے شعروں پر تضمینیں لکھی ہیں۔ ان میں غنی کشمیری کے علاوہ شیخ سعدی' مرزا صائب' عرفی شیرازی' ابو طالب کلیم' فیضی' قاآنی' ملا عرشی' انیسی شاملو' میر رضی دانش اور ملا قدسی شامل ہیں۔ پھر ضرب کلیم میں جن شعراء کو باضابطہ موضوعِ سخن بنایا گیا ہے اور ایک ایک تخلیق ان کے حوالے سے معرضِ وجود میں آئی ہے ان میں حکیم سنائی منصور حلاج' خاقانی اور بیدل شامل ہیں۔ اسی طرح جن شاعروں کے کسی شعر کو اقبال نے اپنی کسی تصنیف کے ماتھے کا یا کسی خاص حصے کے

ماتھے کا جھومر بنایا ہے ان میں مولانا جامی، نظیری نیشاپوری اور عزت بخاری جیسے شاعر شامل ہیں۔ لیکن اپنی شاہکار تصنیف جاوید نامہ میں اقبال کا غنی کشمیری کو حضرت شاہ ھمدانؒ کی خاص مصاحبت میں دکھانا وہ بھی آنسوی افلاک جیسے خاص مقامِ اعلیٰ پر فائز دکھانا وہ کئی لحاظ سے قابلِ غور ہے۔ اسی مقام پر اقبال اپنے مرشد رومی کی روح کو ملا محمد طاہر المتخلص غنی کشمیری کی توصیف وتکریم میں یوں رطب اللسان دکھاتے ہیں۔

''شاعرِ رنگین نوا طاہر غنی فقرِ او باطن غنی ظاہر غنی''

گویا وہ فقر جس کو فخرِ کونین رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے فخر کی چیز قرار دیتے ہوئے فرمایا ہے اَلْفَقْرُ فَخْرِی اُسی الفقر کا رنگ غنی کے باطن وظاہر پر چڑھا ہوا ہے اور اسی فضیلت کے باعث اقبال غنی کی زبان سے وہ اسرار کہلواتے ہیں جو اُس وقت کے زنجیروں میں جکڑے ہوئے برصغیر کو آزادی اور ترقی سے ہمکنار کر سکتے تھے خصوصاً اُس وقت کے آزادی پسند کاروان میں خود اقبال جیسے چند کشمیری الاصل برہمن زادگانِ زندہ دل کا پیش پیش ہونا بڑے فخریہ انداز سے نشاندہی میں لایا گیا ہے۔ اور ان سے شاطرِ افرنگیوں اور مغربی حکمرانوں کے خائف ہونے کا راز بھی بتایا گیا ہے کیونکہ وہ عام کشمیریوں کی بہ نسبت کافی تزبین ہیں۔ پختہ کار ہیں اور سخت کوش ہیں اقبال نے کشمیریوں کی انہی صفات کے ناطے اپنے آبائی وطن کو لائق تعریف گردانا ہے یہ کہہ کر

اصلِ شان از خاکِ دامنگیر ماست مطلعِ این اختران کشمیرِ ماست

اس فخریہ اظہار کو غنی کی زبانی یہ بات کہلوا کر مکمل کیا گیا ہے کہ خطۂ کشمیر کی خاص آب وہوا سے آس پاس کے پہاڑوں کو بھی خاص رنگ وبو نصیب ہو جاتی ہے اور تخلیقی ذہن بھی خاص اونچائیوں کو چھُو لیتے ہیں۔

جاوید نامہ میں دکھائے گئے اپنے خاص تخیلی سفر کے اسی خاص پڑاؤ پر اقبال غنی کو حضرتِ شاہِ ہمدان علیہ رحمہ کا تعارف خاص محسن ومعمارِ کشمیر کی حیثیت سے یوں

کراتے ہیں۔

سید السّادات سالارِ عجم دستِ او معمارِ تقدیرِ امم

تو منجملہ اور فضیلتوں کے اقبال بزبان غنی حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی کو ہی کشمیر کے سب سے بڑے روحانی اور سماجی انقلاب کا اصل بانی قرار دیتے ہیں اور کشمیر کے ہر چھوٹے بڑے پر انکے احسانات کا گہرا اثر ہونے کی بات یوں کرتے ہیں۔

سیدِ آن کشورِ مینو نظیر میر و درویش و سلاطین رامشیر

خطہ را آن شاہِ دریا آستین داد علم و صنعت و تہذیب و دین

اقبال بزبان غنی یہ اسی مردِ مومن کی روحانی تربیت کا ثمرہ قرار دیتے ہیں جو کشمیر کو گوناگوں صنعتی و علمی ترقی کے باعث ایران صغیر کہا گیا ہے بلکہ غنی خود اقبال کو مخاطب کر کے شاہ ہمدان کی تعلیمات کا فیض عام کرنے کا مشورہ ان الفاظ میں دیتے ہیں ؎

آفرید آن مرد ایرانِ صغیر باہنر ہایِ غریب و دلپذیر

یک نگاہ او کشاید صد گرہ خیز و تیرش رابدل راہے بدہ

یہ باتیں کہنے کیلئے غنی کی معنویت اقبال پر تین حیثیتوں سے روشن ہوگئی ہے۔ اول اس لحاظ سے کہ غنی اپنے اہل وطن کی حالت زار دیکھ کر سب سے زیادہ آتش بجان شاعر ہے جو کشمیر کے دوسرے تمام شاعروں میں ممتاز ہے۔ دوئم یہ کہ غنی کا فخرِ غیور اور جوہرِ خودی اقبال کے بنیادی فلسفہ سے قریب کی مناسبت رکھتا ہے سوئم یہ کہ اقبال کی طرح غنی نے بھی مادری زبان کو نہیں بلکہ ایک اکتسابی زبان فارسی کو اسلئے اپنا ذریعہ اظہار چن لیا ہے کہ اُسی میں اسکی آفاقی اپیل والی شاعری بڑے پیمانے پر اپنی دردمندی بانٹ سکتی تھی۔ اسی پس منظر میں اقبال جہاں پنجاب کی ابتری پر افسوس کرنے کے بعد حوض کوثر کے کنارے سے غنی کی دردوسوز میں ڈوبی ہوئی یہ آواز سنتے ہیں کہ

جمع کردم مُشتِ خاشاکی کہ سوزم خویش را گُل گمان دارد کہ بندم آشیان در گلستان

وہاں وہ تضمین کیلئے بھی غنی کا ایسا شعر چنتے ہیں جس میں اپنی متاعِ گُم گشتہ دوسروں کے ہاتھ لگ جانے کا رونا بھی رویا گیا ہے اور ساتھ ہی جس میں مفلوک الحال اور جفاکش کشمیریوں کے استحصال کا وہ منظر بھی موجود ہے جو اقبال نے یوں اُبھارا ہے ۔

بریشم قبا خواجہ از محنتِ او نصیبِ تنش جامۂ تار تارے

اس مضمون کا حامل غنی کا عالمگیر شہرت والا شعر اقبال کی تضمین میں ان الفاظ پر مشتمل ہے ۔

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعان را تماشا کن کہ روشن کرد نورِ دیدۂ اش چشمِ زلیخا را

غنی اقبال کی نظر میں ایسا بلبلِ کشمیر ہے جس کو اقلیم معنی کا امیر بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور جس کے کلام کی تشبیہہ و تمثیل سے معمور کرامت مُردوں کو زندہ کر سکتی ہے۔ ان مفاہیم کے حوالے سے اقبال کے ایسے فارسی اشعار پر تفصیلاً غور کرنا لازمی بن جاتا ہے جن میں روحانی ترقی پانے کے لئے مادی اشیاء کو کم سے کم کرنے اور حقیقتاً کچھ پانے کیلئے کچھ کھونے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ اسی خصوصیت کے تحت غنی اقبال کا محبوب شاعر ہے ۔

غنی آن سخن گویِ بلبل صفیر نوا سنجِ کشمیرِ مینو نظیر

اقبال نے وہ قصہ بھی عمدہ طور نظم کیا ہے جو غنی کی اس عادت سے متعلق مشہور تھا کہ جب وہ گھر سے نکلتا تھا تو دروازہ کُھلا چھوڑ جاتا تھا یہ جان کر کہ اُس گھر کا سرمایہ اُسکی اپنی ذات کے بغیر اور کچھ نہیں۔ اقبال کے الفاظ میں اصل واقعہ سنیئے :۔

یکی گفتش ای شاعرِ دل رسی عجب دارد از کارِ تو ہر کسی
بپاسخ چہ خوش گفت مردِ فقیر فقیر و باقلیمِ معنی امیر
زمن آنچہ دیدند یاران رواست درین خانہ جُز من متاعی کُجاست؟

اقبال کا ترتیب دیا ہوا یہ منظر نامہ اپنی بلندی کو چھو لیتا ہے جب ڈرامائیت کے تحت غنی کشمیری کے سامنے زندہ رود نام سے اپنے آپ کو حضرت شاہ ہمدان کے حضور کشمیر کے حال زار اور کشمیریوں کے استحصال و پائیمالی کی داستانِ غم عرض کرتا دکھاتا ہے جب وہ اِس ذہین قوم کی غریبی اور غلامی کا نقشہ اس دردمندی سے کھینچتا ہے:۔

جان زِ اہلِ خطہ سوزد چُون سپند　　خیز دازَ دل نالہ ہا مے دردمند
زِیرک و دَرّاک و خوش گِلِ ملتے است　　در جہان تردستیٔ او آیتے است
ساغرش غلطندہ اندر خونِ او است　　در نئے من نالہ از مضمونِ اوست
از خودی تا بے نصیب افتادہ است　　در دیارِ خود غریب افتادہ است
از غلامی جذبہٗ ہای او بمرد　　آتشے اندرگِ تاکش فسرد
درزمانے صف شکن ہم بودہ است　　چیرہ و جانباز و پُرٗ دم بود است

آخری شعر میں کشمیریوں کی شجاعت اور غیر تمندی کی روایت بیان کی گئی ہے اس اُمید کے ساتھ کہ اس خطے کی زبوں حالی جلدی پلٹا کھائے گی۔ اسی امید کے تسلسل میں غنی کشمیری کی زبانی وُلر جھیل کی موجوں کو ہمکلام دکھا کر انقلاب کا پیشگی نقشہ یہ کہہ کر کھینچا گیا ہے کہ ہمیں آپس میں سر پھٹول سے بچ کر ساحلِ مراد سے جلد ٹکرانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ الفاظ یہ ہیں ؎

ہیچ مے دانی کہ روزے در وُلر　　موجہٗ مے گفت باموجِ دگر
چند در قلزم بیک دیگر زنیم　　خیز تا یک دم بساحل سر زنیم
باش تابینی کہ بے آوازِ صوُر　　ملتے بر خیزد از خاکِ قبور

●●●

اقبالؔ اور مرزا غالبؔ

گذشتہ تین صدیاں اُردو شاعری کی شاندار پیش رفت کے حوالے سے بالترتیب میر غالب اور اقبال سے منسوب کی جاسکتی ہیں۔ بقول شخصے "یہ تینوں عظیم شاعر برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ کی تین صدیوں کے منفرد اور اعلیٰ ترین ثقافتی نشان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اپنی اپنی صدی کی پہچان بھی ہیں اور اس کی آواز بھی...... میر کا زمانہ یعنی اٹھارہویں صدی برصغیر میں طوائف الملوکی، افراتفری، اضطراب اور کرب کا زمانہ تھا۔ خود میر کے الفاظ میں

جن بلاؤں کو میر سنتے تھے ان کو اس روزگار میں دیکھا

غالبؔ کا زمانہ یعنی انیسویں صدی شروع ہوتے ہی حالات اور دگرگوں ہوگئے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال اور غدر کے حالات نے غالب کے ایسے اشعار میں جگہ پائی ؎

اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل سیلابِ گریہ درپے دیوار و در ہے آج

اقبال کی صدی یعنی بیسویں صدی میں کیا نہیں ہوا اور کیا کچھ دیکھنے میں نہیں آیا اور وہی دیکھ کر اقبال اپنی صدائے درد یوں بلند کرتے ہیں

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

سرزمین اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق انگیز ہے

اپنے وطن اور قوم کی حالتِ زار پر دردمندی سے آنسو بہانے میں اور ایک دیدۂ بینا کی حیثیت سے ترجمانی کا حق ادا کرنے میں اقبال کی شاعری میر اور غالب کی

شاعری کا اگلا ارتقائی قدم ہے۔ حالانکہ میر اور غالب کا امتیاز صنفِ غزل میں ظاہر ہوا ہے جب کہ اقبال کا امتیاز غزل سے زیادہ اس کی اُردو نظموں اور فارسی مثنویوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ خصوصاً شکوہ، جواب شکوہ، مسجد قرطبہ اور ذوق وشوق جیسی نظموں میں نیز اسرارِ خودی، رموزِ بیخودی اور جاوید نامہ جیسی مثنویوں میں۔ البتہ برصغیر کے باہر اقبال کو شہرت ومقبولیت بخشنے میں زبورِ عجم، پیامِ مشرق اور ارمغانِ حجاز نے بھی خاص رول ادا کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں غالب کی فارسی شاعری کو وہ پذیرائی حاصل نہ ہوسکی جس کا اس نے اُردو دیوان غزلیات کے مقابلے میں اپنی فارسی شاعری پر اعتماد ظاہر کیا تھا یہ کہہ کر کہ۔

بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ من است　　فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ

اقبال نے اپنے اردو کلام میں بھی غالب کو خصوصی خراج عقیدت پیش کیا ہے اور فارسی کلام میں بھی اسکو خاص مقام پر فائز دکھایا ہے۔ بانگ درا میں مرزا غالب عنوان کے تحت جو نظم اقبال نے مسدس کے طرز میں لکھی ہے اس کے پانچوں بند غالب کے امتیازات کو اجاگر کرتے ہیں۔ پہلے بند میں غالب کے ممتاز تخیل اور غالب کی دیدہ وری کو ان الفاظ میں یاد کیا گیا ہے ۔

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا　　ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا　　زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

اس نظم کے اگلے چار بندوں میں جہاں شعرِ غالبؔ کی مقبولیت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ تیرا شعر ہر محفل کو رونق بخشنے کا ضامن ہے اور تیری فکر کی کھیتی ہر لحاظ سے سرسبز اور شاداب ہے۔ تیری شوخیٔ تحریر میں زندگی کا راز مضمر ہے اور بے جان تصویروں کو لبِ گویا عطا کرنے کی تیری کرامت قابلِ رشک ہے۔

تیرے لبِ اعجاز پر کلام کو سو ناز ہیں جب کہ تیرے اونچے مضامین کو دیکھ کر ثریا بھی محوِ حیرت ہے۔ تیرا اندازِ بیان ایسا ہے کہ مضمون خود اس پر تصدق ہونے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ تیری عظمت کا شگوفہ شیراز کے پھولوں پر بھی خندہ زن ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ گویا سعدی شیرازی، حافظ شیرازی کا ہم پلہ ہونے کے ناطے ہی غالب عرفی جیسے عظیم شاعر پر یہ کہہ سکنے کی جسارت رکھتا ہے۔

عرفی کسیست لیک نہ چون من درین چہ بحث

غالب کو اسی بند میں اقبال جرمنی کے گوئیٹے نامی عظیم شاعر کا ہم نوا قرار دیتا ہے اگلے بند میں اقبال غالب کو مخاطب کر کے یہ سچ تسلیم کرتا ہے کہ لطفِ گویائی میں تیری ہم سری ممکن نہیں جب تک تیری جیسی بلندیٔ فکر نصیب نہ ہو جائے۔ غالب کو اقبال اُردو زبان و ادب کا خاص معمار بھی تسلیم کرتا ہے اور خاص محسن بھی۔ اس نظم کے آخری بند میں اقبال شہرِ دہلی کو اب تک غالب جیسے عظیم سخن گو پر ماتم کناں دکھاتا ہے اور اسی شہر کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

اے جہاں آباد اے گہوارۂ علم و ہنر ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

اُردو نظم میں غالبؔ کو بے مثال فخرِ روزگار اور گوہرِ آبدار قرار دینے والا اقبال اپنی سب سے زیادہ مایہ ناز فارسی مثنوی جاوید نامہ میں بھی تری ہری، غنی کشمیری اور ناصر خسرو جیسے بلند پایہ شاعروں سے پہلے غالب کو خاص مقام پر فائز دکھاتا ہے اور اپنے تخیلی سفر میں غالب کو مولانا رومی کی طرح رمز آشنای حیات و ممات ظاہر کرتا ہے۔ اس سفر میں اپنے آپ کو زندہ رود جیسا متحرک نام رکھ کر غالب کے ساتھ کئی مکالمے ترتیب دیتا ہے جو

فلکِ مشتری کے حوالے سے گہرے مطالعہ کا تقاضا کرتا ہے۔ پہلے مکالمے کا آغاز غالب کو دردِ جستجو کا پیکر گردان کر زندہ رود اس سے سوزِ جگر سے متعلق ایک فارسی شعر کا مفہوم پوچھتا ہے جو غالب کے ہی بلند تخیل کی تخلیق ہے۔ غالب اپنے اس شعر کی تشریح میں یہ چھ فارسی شعر اقبال کو عنایت کرتا ہے ؎

نالۂ کُو خیزد از سوزِ جگر ہرکجا تاثیر او دیدم دگر
قمری از تاثیرِ او شُد سوختہ بلبل ازوی رنگہا اندوختہ
اندر و مرگی بہ آغوشِ حیات یک نفس اینجا حیات آنجا ممات
آنچنان رنگی کہ ارژنگی از دست آنچنان رنگی کہ بیرنگی ازوست
تو ندانی این مقامِ رنگ وبو ست قسمتِ ہر دل بقدرِ ہای دہوست
یابرنگ آ یابہ بی رنگی گذر
تانشانی گیری از سوزِ جگر

●●●

اقبال کے ایک ایرانی عاشق.....علی شریعتی

علامہ اقبال جیسے ممتاز دیدہ ور، عہد ساز ملی شاعر اور بلند پایہ مُفکر کی طرف سے جدید ایران کی سوچ پر پڑے ہوئے ان تمام انقلاب نواز اثرات کی نشاندہی ایک چھوٹے سے مقالے میں بعید از قیاس ہے، جو اثرات وہاں اسلامی انقلاب کے بانی امام خمینی علیہ الرحمۃ پر پڑے ہیں یا اُن سے پہلے جو اثرات انقلاب کی پیش رفت علمی حلقوں میں یقینی بنانے والے آتش نوا مقرر، سماجی علوم کے ممتاز ماہر اسلام شناسی اور خود سازی، جیسی چند فکر انگیز نثری کتابوں کے مایہ ناز مصنف ڈاکٹر علی شریعتی کی پہلو دار شخصیت تعمیر کرنے میں کارفرما رہے ہیں۔ شریعتی کے ذہن و دل کی تربیت کرنے میں کلامِ اقبال کے اثرات کی کارفرمائی کا اندازہ لگانے کے دو اولین زینے اقبال کے تئیں عقیدت و احترام ظاہر کرنے والے شریعتی کے وہ دو لیکچر ہیں جو اب دو کتابچوں کی شکل میں چھپ چکے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام ''اقبال مصلحِ قرنِ آخر'' اور دوسرے کا نام ''ما و اقبال'' ہے قبل الذکر کتابچے کا اردو ترجمہ اقبال انسٹی چیوٹ کے ایک سابقہ ریڈر کبیر احمد جائیسی نے کیا ہے۔ موصوف اپنے ترجمہ کے مقدمے کا آغاز جس عبارت سے کرتے ہیں اس کا دوسرا سرا یہاں پر بھی ایک مختصر تمہید کا کام دے سکتا ہے۔ موصوف رقمطراز ہے:۔

> ''اگر ایران کا ہر فردِ بشر ''مرگ بر شاہ'' اور ''درود بر خمینی'' کا نعرہ نہ لگاتا' آیت اللہ خمینی کی دعوت پر لبیک نہ کہتا' مائیں اپنے بچوں' بہنیں اپنے بھائیوں اور بیویاں اپنے شوہروں کو اسلامی انقلاب کی راہ میں ہنسی خوشی قربان نہ کر دیتیں تو کیا یہ ممکن تھا کہ آیت اللہ خمینی کی تنہا کوششیں بار آور

ہوتیں۔ اگر آیت اللہ خمینی کے افکار ونظریات پر لبیک کہتے ہوئے علما کے علاوہ ایرانی دانش وروں کا بہت بڑا طبقہ آگے نہ بڑھتا اور ایران کے مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں آیت اللہ خمینی کے افکار وخیالات کی ترویج واشاعت نہ کرتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ جس نوجوان طبقے کو شاہ اور اس کی خفیہ پولیس ''ساواک'' نے شراب اور جنس میں گلے تک ڈبو دیا تھا۔ وہی نوجوان طبقہ اسلامی انقلاب کا ہراول دستہ بنتا؟ علماء کے علاوہ دانشور طبقہ کے جن افراد نے اسلامی انقلاب کی راہ ہموار کی اور اس مقصد عظیم کیلئے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کر دی ان میں سرفہرست مرحوم ڈاکٹر علی شریعتی کا نام آتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر علی شریعتی قرآن وحدیث کے بعد اگر کسی چیز سے متاثر ہوئے تو وہ کلامِ اقبال اور صرف کلامِ اقبال تھا''۔

علی شریعتی کی تعینِ قدر کا معاملہ اصل میں کلامِ اقبال کو عملی جامہ پہنانے والوں میں ایک ممتاز نام کو اُجاگر کرنے کا معاملہ ہے۔ یہ بیسویں صدی کے ایک سینئر مفکر کے مقابلے میں اس کے ایک ہم مشرب جونیئر مفکر کی تعینِ قدر اور حُسنِ تعارف کا معاملہ ہے۔ خاص طور پر اس حقیقت کے پیش نظر کہ ابھی فارسی سے عملاً دور ہو گئے ہوئے کشمیر کے بیشتر علمی اور ادبی حلقے بھی مرحوم علی شریعتی کی انقلاب پرور شخصیت سے پوری طرح واقف نہیں ہیں اسلئے بہت سی باتوں کا احاطہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن موجودہ ایران کی قابلِ فخر شخصیتوں میں ایک امتیازی شان رکھنے والے اور بڑے پیمانے پر قلمی جہاد کرنے والے شہید علی شریعتی کی مِلّی دردمندی، انقلاب دوستی، اقبال شناسی اور ذاتی بصیرت ودانشوری کی چند جھلکیاں علامہ اقبال کی اثر پذیری کے حوالے سے دکھانے کیلئے بہتر صورت یہی معلوم ہوتی ہے کہ مقالہ نویسی کی روایت سے ذرا ہٹ کر

آج اپنے تنقیدی تبصروں کے بغیر ہی شریعتی اور شریعتی شناسوں کے چند اقتباسات کی ایک فکر انگیز قوس قزح ترتیب دی جائے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے کی بات اہلِ نظر اور نکتہ دان قارئین پر ہی چھوڑ دی جائے کہ علامہ اقبال کا اثر مرحوم شریعتی پر کس قدر گہرا رہا ہے اور یہ بھی کہ شریعتی اقبال کے افکار و عقائد کو اپنانے میں کس حد تک کامیاب رہا ہے۔

لیکن اقتباسات کی قوسِ قزح پیش کرنے سے پہلے ایران میں شعر شناسی اور دین شناسی کے معیار اور ترجیحات میں بھی ایک گونہ تبدیلی رونما ہونے سے متعلق دو تعجب خیز اور غور طلب باتیں توجہ چاہتی ہیں۔

ایک تو فارسی زبان کے مختلف النوع ادبیاتِ عالیہ سے شناسائی اور دلچسپی رکھنے والے بیشتر سخن شناسوں اور نکتہ سنجوں کیلئے یہ بات بڑی ہی تعجب خیز اور غور طلب ہے کہ علامہ اقبال کے کلام میں وہ کون سی جاذبیت، بصیرت، رِفعت اور جِدت تھی جس کی بدولت آپ کے عرصہ حیات میں ہی ایرانی زباندانوں اور شعر فہموں کے یہاں کلام اقبال کو وہ پذیرائی حاصل ہوگئی جو وہاں برصغیر کے امیر خسروؔ، شیخ فیضیؔ، مرزا بیدلؔ اور مرزا غالبؔ جیسے عظیم فارسی گو شاعروں اور پختہ فن کاروں کو گذشتہ کئی صدیوں کے دوران بھی حاصل نہ ہو سکی ہے۔ حالانکہ فارسی ان سب کی مادری زبان تھی اور پھر ان سب نے اپنی امتیازی فارسی دانی اور فارسی گوئی پر بڑے ہی ناز و افتخار کا اظہار بھی کیا تھا لیکن ان کی خود اعتمادی اور حُسنِ ظن کے باوصف ان سب کو ایران میں سبکِ ہندی کے گنہگار قرار دے کر متوقع پذیرائی سے محروم ہی رکھا گیا۔ حتیٰ کہ ان کی چھوٹی بڑی لسانی اور فنی لغزشوں کو ضرورت سے زیادہ اُچھالنے سے بھی دریغ نہ کیا گیا۔ البتہ ان عظیم شعراء کے برعکس ایران میں بے حد قدر و منزلت سے دیکھے جانے والے علامہ اقبال کے لئے فارسی بھی اردو کی طرح ایک ایسی اکتسابی زبان تھی جس کو انہوں نے اپنے مِلّی جذبات اور اِنقلابی خیالات کو وُسعت سے ہمکنار کرانے کیلئے وسیلۂ اظہار بنانے کا اقدام اس عِجز و اِنکساری

کے ساتھ شروع کیا تھا کہ

ہندیم از فارسی بیگانہ ام ماہِ نو باشم تہی پیمانہ ام

میرے خیال میں ایران میں اقبال کی اس پذیرائی اور قدر دانی کا بنیادی سبب آپ کے کلام کا وہ فکری اور معنوی پہلو ہے جو ملی جذبہ کے احیاء اور اجتہادی نظریہ سے عبارت ہے جو شاعرِ مشرق اور جدید ایرانی دانشوروں کے درمیان سب سے بڑی قدرِ مشترک کا درجہ رکھتا ہے۔

دوسری غور طلب اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ آج کے ایرانی اقبال شناسوں میں علی شریعتی کو ویسا ہی امتیازی مقام کیونکر حاصل ہو گیا ہے' جیسا مولانا رومؔی کے ہندی ارادتمندوں میں خود علامہ اقبال کو حاصل ہے۔ حالانکہ کئی ہی برس پہلے چند وجوہات کی بنیاد پر شہنشاہی دور میں ایران کے ملک الشعراء آقای محمد تقی بہار اور سر برآوردہ ادبی نقاد و مورخ آقای سعید نفیسی جیسے اقبال شناسوں کیساتھ علی شریعتی کا نام تک لینا بھی ایک باغیانہ اقدام تھا۔ شاید اسی وجہ سے آقائی احمد سروش جیسے محقق نے بھی ایران میں پہلی بار علامہ اقبال کا فارسی کلیات مرتب کرتے وقت اپنے مبسوط مقدمے میں شریعتی کا نام نظر انداز کیا ہے۔ حالانکہ مقدمے کے اختتام پر احمد سروش نے وضاحتاً حاشیے میں لکھا ہے کہ ہم یہاں پر ایران کے ان پروفیسروں' دانشوروں اور شاعروں کے نام تقدیم و تاخیر ملحوظ رکھے بغیر درج کر رہے ہیں' جنہوں نے اپنے مقالات یا پیغامات یا تقاریر یا نظم و نثر پر مبنی مختلف تحریروں کے ذریعے مولانا محمد اقبال لاہوری کے تئیں اپنا خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ لکھ کر احمد سروش نے یونیورسٹی پروفیسروں اور دانشوروں میں ایک منفرد مقام رکھنے والے علی شریعتی کو نظر انداز کر کے باقی اکتیس ایرانی اقبال شناسوں کے نام اس ترتیب سے لکھے ہیں:

ملک الشعراء بہار' علی اکبر دہخدا' ادیب السلطنہ سمیعی' صادق سرمد' سید حسن تقی

زادہ حسین علاء، سید ضیاالدین طباطبائی، علی اصغر حکمت، مجتبیٰ مینوی، محیط طباطبائی، دکتر محمد معین، دکتر مصطفیٰ صورتگر، سعید نفیسی، دکتر حسین خطیبی، محمد زرنگار، خواجہ دکتر عبدالحمید عرفانی، غضنفر علی، صادق نشاط، عبدالحسین نوایی، محمد حجازی، دوشیزہ دکتر کچکینہ کاظمی، دکتر رجائی، علی فدائی، دکتر قاسم رسا، رہی معیری، امیری فیروز کوہنی، گلچین معانی، حبیب یغمائی، سرجائی، ادیب برومند، کاظم رجوی، دکتر رازرانی، پروفیسر السانرو بائیوزانی۔

علی شریعتی ایران کے ان تمام اقبال شناسوں میں نسبتاً کم عمری میں وفات پانے والے دانشور ہونے کے علاوہ بہتوں سے عمر میں بھی چھوٹے تھے۔ لیکن در عمر کہتر و در علم بہتر کے مصداق ڈاکٹر علی شریعتی کی اقبال شناسی ان میں سب سے زیادہ غائر مطالعہ اور ہمہ گیری کا پتہ دیتی ہے۔ علی شریعتی کے اس امتیاز کا اندازہ ان چند سطور سے بھی لگایا جا سکتا ہے جن کو آپکے اقبال پر دیئے گئے اہم ترین لکچر ''اقبال مصلحِ قرن آخر'' کے اُردو ترجمے سے مستعار لے کر یہاں پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ سطور ملّی کردار اور مثالی انسان کی بازآفرینی سے متعلق تجدیدِ ساختماں حصے سے ماخوذ ہیں شریعتی کہتے ہیں:۔

> ''اقبال غزالی، محی الدین ابن عربی یا مولانا روم کی طرح کے مسلمان عارف نہیں، جو صرف متصوفانہ اور ماورائی حالات کے بارے میں غور و فکر کرتے رہے اور اپنے انفرادی تکامل، تزکیۂ نفس اور روشن ضمیری کی وجہ سے اپنے ہی جیسے چند آدمیوں سے راہ و رسم رکھتے رہے اور باہر کی دنیا سے اس طرح غافل رہے کہ ان کو منگولوں کے حملوں، حکومت کے جبر و ستم اور عوام کی بندگی و بیچارگی کی خبر بھی نہ ہو سکی''۔

یہ کہنے کے بعد ڈاکٹر شریعتی علامہ اقبال کو ابومسلم خراسانی، حسن بن صباح، صلاح الدین ایوبی اور سرسید احمد خان جیسے انقلاب پرور لوگوں میں شمار کر کے ان کی بسیار شیوہ شخصیت کے خاص پہلو یوں اجاگر کرتے ہیں..... ''اقبال کی شخصیت وہ شخصیت

ہے جو نہ تو اہلِ مغرب کے اس خیال کے موئید ہے کہ علم ہی انسان کی نجات' ارتقاء اور تمام دُکھ درد کا مداوا ہے۔ اور نہ ہی وہ ان فلسفیوں کے ہم خیال ہیں جو انسان کی معاش اور معاشی ضرورتوں کو اس کی تمام ضرورتوں کا سرچشمہ سمجھتے ہیں اور نہ ہی اپنے ہم وطنوں یعنی بودھوں اور ہندوؤں کے بڑے بڑے مفکروں کی طرح اس بات کے قائل ہیں کہ انسانی روح کا اس سنسارک جیون اور کرما چکر سے نکل کر نروان حاصل کر لینا ہی بشریت کی معراج ہے۔ اقبال اپنے ہموطنوں کے اس خیال کا بھی قائل نہیں کہ ایسے ماحول میں جہاں بھوک' غلامی' غریبی اور ذلت و پستی موجود ہو وہیں پر پاک روحیں سعادت مند انسانوں اور اخلاقی پاکیزگیوں کو جنم دے سکتی ہیں..... اقبال جس اسلامی فکر کے معتقد ہیں وہ فکر انسان کی مادی حاجتوں کی طرف پوری توجہ دینے کے ساتھ ساتھ انسان کو ایک ایسا دل بھی بخشتی ہے جو ان ہی کے قول کے مطابق سپیدۂ سحری کے ذوق و شوق اور غور و فکر سے زندگی کے خوبصورت لمحات کو دیکھتا ہے....." اقبال کا وجدان و احساس' تصوف' مسیحیت یا لاؤزی' بودھی اور چینی مذاہب کے احساس و وجدان کی طرح نہیں ہے جو علم' عقل اور علمی پیشرفت کو تحقیر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اسی طرح سے اقبال کا علم بھی فرانسس' بیکن اور کلوڈ برناڈ کی طرح کا وہ خشک علم نہیں ہے جو صرف مظاہر قدرت کا باہمی ربط اور مادی زندگی کیلئے طبیعی قوتوں کے استعمال تک محدود ہو۔ اسی کیساتھ ساتھ اقبال ایسے مفکر بھی نہیں ہیں جو فلسفہ' وجدان' علمِ دین' عقل اور روح کو باہم دگر اس طرح خلط ملط کر دیں جسکی مہمل ترین مثال داراشکوہ اور اس قبیل کے دوسرے مفکرین کے یہاں ملتی ہے..... بنی نوع انسان کے نام اقبال کا سب سے عظیم پیغام یہ ہے کہ اس کا دل عیسیٰ کی طرح' فکر سقراط کی طرح اور قوت و طاقت قیصر کی طرح ہو۔ مگر یہ تمام صفات ایک انسان یعنی ایک وجود بشری میں مجتمع ہوں اور ان تمام صفات کی اساس ایک ہی روح پر ہو" .....

ڈاکٹر شریعتی کلامِ اقبال کا غائر مطالعہ کر کے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اقبال کی شخصیت اپنے زمانے کی بیدار ترین شخصیت تھی۔ اتنی بیدار کہ لوگ ان کو ایک سیاسی رہنما ایک رہبرِ آزادی اور بیسویں صدی کی استعماریت کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں۔ اقبال کی علمی فلسفیانہ شخصیت کی بلندی کا عالم یہ ہے کہ آج کی مغربی دنیا ان کو برگساں کی طرح کا ایک فلسفی اور مفکر تسلیم کرتی ہے۔ تاریخ اسلام میں اقبال کا شمار غزالی کی صف میں ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہم ان کو اسلامی معاشرہ کا ایک مصلح بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ انسانی' اسلامی اور اس معاشرے کے سلسلے میں سوچ بچار کرتے رہتے ہیں' جس میں وہ خود زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس معاشرے کی نجات اور آزادی کیلئے وہ جہاد بھی کرتے ہیں ان کا یہ جہاد علمی یا تفنن طبع کے طور پر یا سارتر کے الفاظ میں ''بائیں بازو کے روشن فکرانہ سیاسی مظاہر'' پر مبنی نہیں۔ بلکہ اس ضمن میں وہ ایک ذمہ دار مجتہد کی حیثیت سے درپیش مسائل پر نظر ڈالتے ہیں۔ کام کرتے ہیں اور راہِ نجات کی تلاش بھی کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ اقبال مولانا روم کے بھی عاشق ہیں۔ مولانا روم کی روحانی معراج میں اقبال ان کے ہم سفر ہوتے ہیں۔ روحانی عشق و عاشقی اور درد و اضطراب سے داغ داغ ہو کر اقبال میں سوز و گداز پیدا ہوتا ہے لیکن وہ ایک ایسے عظیم انسان ہیں جو یک رخے نہیں ہیں وہ ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوئے' وہ ایک ایسے مسلمان ہیں جن کی شخصیت کسی ایک ہی رخ پالیسی' ایک ہی پہلو کی اسیر ہو کر نہیں رہی۔ بلکہ وہ ''مکمل و سالم مسلمان'' ہیں۔ اگر چہ وہ مولانا روم سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں مگر کسی وقت بھی ان کی شخصیت مولانا کی شخصیت میں ضم نہیں ہوتی ہے اور نہ ان کی شخصیت کسی ایک پہلو کی طرف جھکاؤ رکھنے کی وجہ سے اسی پہلو کی طرف ضم ہوتی ہے۔

اقبال ایک فلسفی کی حیثیت سے یورپ گئے اور وہاں کے آسمان پر چمکے۔ انہوں نے مغرب کے فلسفیانہ مکتبِ فکر کو سمجھا اور لوگوں کو اس کا خوب وزشت سمجھایا۔

تمام لوگوں کو اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ بیسویں صدی عیسوی کے ایک ایسے فلسفی ہیں جو مغربی فکر کے اسیر ہو کر نہیں رہے بلکہ انہوں نے مغرب کو مسخر کیا اور ایک ناقدانہ فکر اور قوتِ انتخاب کے ساتھ بیسویں صدی اور مغربی معاشرہ میں زندگی بسر کرتے رہے۔ اقبال نے مولانا روم کے شیفتہ و مرید ہونے کے باوصف ان کے مقابلے میں اپنی اصل جہتوں کو اس طرح محفوظ رکھا کہ وہ اصل اسلامی روح سے مختلف نہیں۔

ڈاکٹر شریعتی اقبال شناسی کا ایک ایسا برجستہ اظہار کرنے کے بعد ''نہ چھوٹی سردیٔ مغرب میں بھی مجھ سے سحر خیزی' اور ''اگر زمانہ باتو نسازد تو باز مانہ ستیز'' جیسے اجتہادی نظریوں کی پذیرائی کر کے اپنے دعویٰ کی دلیل مکمل کرتے ہیں۔ اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ حقیقی اسلام کو سمجھنے کی سب سے زیادہ روشنی انہیں قرآن' احادیث اور اصحاب رسولؐ کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد کلامِ اقبال سے ہی ملی ہے۔

اب ہم اس عظیم اقبال شناس اور معلمِ انقلاب اسلامی در ایران کی پر آشوب حیات کے چند پہلوؤں پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کی غرض سے صرف اتنا کہیں گے کہ علامہ اقبال کی وفات کے پانچ سال پہلے خراسان کے ایک دور افتادہ علاقے میں وہ ۲۳ر نومبر ۱۹۳۳ء کے روز ایک مشہور عالمِ دین آقای محمد نقی شریعتی کے گھر میں پیدا ہو گئے تھے۔ علی شریعتی کے دادا آخوند حکیم ایک دور افتادہ علاقے میں سکونت پذیر ہونے کے باوجود ایران میں تحریکِ مشروطیت شروع ہونے سے پہلے بادشاہ ناصر الدین قاچار کے زمانے میں فقہ جعفریہ کے بہت ممتاز عالم جانے جاتے تھے۔ ایسے ایک اعلیٰ گھرانے کے چشم و چراغ ہونے کی حیثیت سے علی شریعتی نے چھوٹی عمر میں ہی بہت سے علوم تک رسائی پائی تھی۔ کچھ عرصہ تک مشہد کے ایک مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اسی علمی اساس کی بناء پر آپ اعلیٰ تعلیم کیلئے فرانس جانے اور وہاں سوشیالوجی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ فرانس میں اپنے پانچسالہ

قیام کے دوران سنجیدہ علمی مشاغل کے علاوہ علی شریعتی ایران میں اسلامی انقلاب کی پیش رفت کیلئے بڑی سرگرمی سے کام کرتے رہے۔ بلکہ الجزائر کی تحریک آزادی کو نقطہ عروج تک پہنچانے کیلئے بھی وہ ایسے انہماک سے کام کرتے رہے جیسے الجزائر بھی ان کا آبائی وطن تھا۔ اس جرم کی پاداش میں جہاں فرانس کی حکومت نے انہیں کچھ عرصہ کیلئے گرفتار بھی کرلیا' وہاں فرانٹز فینن ہواری بومدین اور محمد بن بلا جیسے چوٹی کے الجزائری لیڈر شریعتی کے دوست اور مداح بن گئے۔ ایران واپس آکر علی شریعتی کو نئی طرح کے پاپڑ بیلنا پڑے۔ چنانچہ جہاں آپ کے درس و تدریس کے پروگراموں پر قدغن لگائی جاتی ہے وہاں اس معلمِ انقلاب کو مشہد کے ایک دور افتادہ قصبے میں جلاء وطن بھی کیا جاتا ہے تاکہ وہ یونیورسٹی اور کالجوں کے طلباء کے دلوں میں اپنے لیکچروں سے تخمِ انقلاب بونے سے باز رہے۔ لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ علی شریعتی مشہد یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرار منتخب ہو جانے کے بعد تہران یونیورسٹی اور اس کے قریب واقع کئی بارسوخ عالموں اور دانشوروں کی سرپرستی میں قائم کئے گئے حسینیہ ارشاد جیسے انقلاب نواز دینی ادارہ سے وابستہ جوانوں کے عزیز ترین استاد اور مربی بن گئے۔ حسینیہ ارشاد کہنے کو تو ایک دینی مدرسہ تھا لیکن آیت اللہ مظہری جیسے علماء اور علی شریعتی جیسے دانشوروں کی وابستگی نے اس ادارے کو حریت پسندوں کی خاص تربیت گاہ بنا دیا تھا۔ شریعتی کی باغیانہ روش کا اثر جنگل کی آگ کی طرح پورے ایران کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ جب ساواک نے حسینیہ ارشاد کو بند کروا دیا۔ علی شریعتی کی کتابیں بند کر دی گئیں اور ان پر یہ پابندی لگا دی گئی کہ وہ کسی پبلک جلسے میں کوئی تقریر نہ کریں۔ ساواک شریعتی کو شاہ کا سب سے بڑا دشمن سمجھتا تھا۔ اسلئے علی شریعتی کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ وہ روپوش ہو گئے تو ان کے انقلاب پسند والد کو اس توقع کے تحت گرفتار کرلیا گیا کہ اس کو چھڑانے کیلئے علی شریعتی اپنے آپ کو گرفتاری کیلئے ظاہر کر دے گا۔ ایسا ہی ہوا یوں مزید اٹھارہ ماہ کی

قید وایذا شریعتی کے حصے میں آگئی۔ اس دوران آپ کی گرفتاری کے خلاف ایران میں اور ایران کے باہر اتنا سخت ردعمل ہوا کہ شاہ ایران کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور ہونا پڑا۔ کبیر احمد جائیسی نے شریعتی کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد سو سے زیادہ بتا کر ان میں سے بتیس کے نام بھی درج کر لئے ہیں۔ انقلابی شعور کی آبیاری کرنے والی ان متعدد نگارشات کے بعد ۱۹۷۷ء میں ڈاکٹر علی شریعتی کی موت (قیامِ لندن کے دوران) ایسے پراسرار حالات میں واقع ہوگئی کہ ساواک اور سوشلسٹوں کی عرصہ سے جاری آپ کے خلاف سازشوں کے تناظر میں علی شریعتی کو بہر حال ایک شہید ملت قرار دیا جاتا ہے۔ شریعتی کو قید و بند کی صعوبتوں اور شہادت کی سعادتوں تک پہنچانے کے عوامل کی نشاندہی کرتے ہوئے آپکے ایک کتابچے کو ''انسان اور اسلام'' عنوان کے تحت ترجمہ کرنے والے قمر احسن نے آپ کے جرمِ بے گناہی کا نقشہ کچھ اس طرح سے کھینچا ہے۔

''اسلامی نشاۃ ثانیہ کی ایجاد کرنے اور تاریخ و تہذیب ملت اسلامی کے جسمِ مردہ میں تازہ روح ڈالنے کیلئے ڈاکٹر شریعتی کی زبان نے دوہرے وار کئے۔ ایک طرف تو خرافات اور بدعات و رسوم جو کہ قدیم سے ایرانی تہذیب و قوم میں سرایت کر گئی تھی۔ اور نہ صرف یہ کہ غیر اسلامی تھی بلکہ سرچشمہ مکتب اسلام یعنی قرآن سے اپنی پیاس بجھانے سے سراسر مانع ہوتی تھی۔ تو دوسری طرف جدت پرستی اور مغرب زدگی تھی۔ ڈاکٹر شریعتی نے ان دونوں رویوں کی بیخ کنی کی اور ان لوگوں کو اپنی سخت ترین تنقیدوں کا نشانہ بنایا' جو ان کے علمبردار تھے۔ ایک طرف تو ان جہلاء کو جنہوں نے قرآن سے دوری کی بناء پر عظیم ترین انسان ساز مکتب یعنی اسلام کو گوناگوں خرافات کا معجونِ مرکب بنا دیا تھا دوسری طرف ان احمقوں اور نقالوں کو جو طوطے کیطرح مغرب کی باتوں کو رٹ رٹ کر دہراتے رہتے تھے''۔

ڈاکٹر شریعتی کے نزدیک اسلام انسانی مذاہب کی اعلیٰ ترین سُنتوں کا حامل

ہے ان کی اصطلاح میں اسلام نام ہے' زر' زور اور تزویر کے خلاف جہاد کا۔ اُس دور میں تیزی سے پھیلتے ہوئے کمیونزم اور سوشلزم کا توڑ کرنے کیلئے ڈاکٹر شریعتی بعض ایسی اصطلاحیں بھی وضع کرتے رہے جن کو تاکنے والے علماء آڑ بنا سکتے تھے۔ مثلاً جب وہ اصحاب رسولؐ میں سے حضرت علی کے بعد حضرت ابوذرِ غفاری کو خاص اعزازات کا مستحق گردانتے ہوئے انہیں پہلا خدا پرست سوشلسٹ قرار دیتے ہیں یا جب وہ فرماتے ہیں کہ تمام ابراہیمی پیغمبر (ماسوائے چند) یا تو گلہ بان تھے یا اپنے دور کے محروم ترین انسان تھے اور صرف اس وجہ سے کہ مبعوث بہ رسالت تھے وہ سب حُکامِ زور' اربابِ زر اور اولیائے تزویر کے مقابلہ پر جم گئے تھے اور حقیقی خدا پرست سوشلسٹ نظام قائم کرتے رہتے تھے۔

ان لغزشوں کے باوجود ڈاکٹر شریعتی شیعہ سنی اتحاد کے سچے علمبرداروں میں سے تھے وہ ان دو مسلکوں میں دوری پیدا کرنے کی ساری ذمہ داری مغرب کے اسلام دشمنوں اور مشرق کے گندم نما جوفروش ملاؤں پر عاید کرتے ہیں۔ ڈاکٹر علی شریعتی کا پیغام یہ ہے کہ مسلکی منافرت کو سب سے بڑی اسلام دشمنی سمجھ کر ہمیشہ کیلئے دفن کر لینا چاہئے اور حقیقی سرچشمہ حیات حقیقی اسلام کی طرف بازگشت کرنی چاہئے اور یوں دل ونظر کی پاکیزگی اختیار کر کے اسلامی تہذیب کے اولین منبع سے کسبِ فیض کرنا چاہئے۔ تاکہ اسلام کی پرشکوہ تہذیب وتمدن کی بازیافت ہو سکے قمر احسن کا خیال ہے کہ ڈاکٹر شریعتی کا یہ مشورہ قبول کرنے سے مسلمانوں کو آج کے غلیظ اور متعفن تہذیب سے اور انسانیت مخالف گوناگوں ازموں سے نجات مل سکتی ہے۔ ڈاکٹر شریعتی کے ان خیالات میں جہاں کلام اقبال کی صدائے بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ وہاں ان کے مشترکہ افکار وعقائد کی ایسی رنگینیاں بھی نکھر کر نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ جن میں ان دو اسلامی مفکروں کے سوزِ درون کی وہ زیریں لہر بھی محسوس ہو جاتی ہے جو ان کے دل میں عالمِ

اسلام کے دانش وروں کو متحد کرنے کیلئے جاری تھی۔ اس ضمن میں حقِ تقدم کو ملحوظ رکھ کر ان دونوں کے افکار و عقائد سے متعلق ایک دو مثالیں ہی کافی سمجھی جائیں گی۔

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں شکوہ اور جواب شکوہ علامہ اقبال کی معرکۃ الآرا تخلیقوں میں شامل ہیں۔ ایسی تخلیقوں کے ذریعے شاعرِ مشرق نے اُمتِ مسلمہ کے باہوش افراد کو بعض دُوررس اثرات والی خامیوں کی طرف متوجہ کرنے کا بیڑا اٹھا کر در اصل اس امت کے اہلِ درد اور اہلِ خرد کو اصلاحِ احوال کی دعوت دی ہے۔ مثلاً زمین پر اُتارے گئے اللہ کے سب سے بڑے اور آخری تحفے یعنی قرآن معظم کے تعلق سے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کر کے تبلیغی مقاصد کو استحکام بخشتے رہنے کے تعلق سے علامہ اقبال اپنے آپ کو مسلمانوں کے ایک درد مند نمائندے کی حیثیت سے اللہ کی بارگاہ میں یوں شکوہ سنج دکھاتے ہیں۔

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے ہے خوشی انکو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزلِ دہر سے اونٹوں کے حدی خوان گئے اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے
خندہ زن کُفر ہے، احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

پھر اس بند کی رعایت سے شاعر جواب شکوہ میں اللہ جل شانہٗ کو مسلمانوں کے شکوہ سنج نمائندے کے ساتھ ان کے قابلِ تقلید ماضی کی یاد تازہ کرنے کیلئے جواباً یوں کہتے دکھایا گیا ہے کہ

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا کس نے؟ نوعِ انسان کو غلامی سے چھڑایا کس نے؟
میرے کعبے کو جبینوں سے بسایا کس نے؟ مرے قرآن کو سینے سے لگایا کس نے؟
تھے تو آباء وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

خود مطالعہ کر کے دیکھئے، کہ شاعر نہ ہو کر بھی ڈاکٹر شریعتی کیسی کیسی دردمندی سے مسلمانوں کو ہجرت اور قرآن کی اہمیت ذہن نشین کرانے کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شریعتی نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب ''اسلام شناسی'' میں بہت سی قرآنی اور دیگر علمی اصطلاحات (terms) کی مخصوص توجیہہ بالکل جدید ڈھنگ سے پیش کی ہے۔ مثلاً اس کے صفحہ ۳۲۲ پر موجودہ مادہ پرست انسان کے اخلاقی اور فکری بحران کی بنیادی وجہ ایثار کے فقدان کو قرار دینے سے پہلے ایثار کو اعلیٰ ترین عملی عبادات کی روح گردانا گیا ہے۔ چنانچہ ص ۳۱۴ پر ایثار کی توجیہہ کچھ اس طرح کی گئی ہے ''ایثار قربانی است برائے بخشیدن ہمہ چیز و گرفتن ہیچ چیز' یعنی اے فرد بمیر تا دیگران بمانند' اسارت (قید و بند) را بپذیر تا دیگران بہ آزادی برسند۔ زندگیت را در خدمت مردم برنج تا نسلہائے بعدی بتوانند خوب زندگی کنند' اما چرا؟ 'ہیچ پاسخی نیست''۔

علامہ اقبال نے قرآنِ حکیم کو مسلمانوں کا مکمل ضابطۂ حیات' اور آئینِ شریعتِ محمدیؐ کہنے کے علاوہ اِس کو امتِ مسلمہ کا ید بیضا بھی قرار دیا ہے اور یہ بات واضح کر لی ہے کہ اگر اسلام دشمن عناصر اور ابلیس کے ایجنٹ کسی چیز سے خوفزدہ ہیں تو صرف اس بات سے کہ مسلمان آپس میں مسلکی شکر رنجیاں ختم کر کے بحیثیتِ ملت قرآن کو زندگی کے ہر شعبے میں نافذ العمل بنانے کا کہیں پھر سے ارادہ نہ بنالیں۔ اور قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر کہیں پھر سے دُنیا پر نہ چھا جائیں۔ عالمی سطح پر اسلام دشمنوں کے اسی خوف کی فکر انگیز عکاسی علامہ اقبال نے اپنے آخری دور کی مشہور اور معرکۃ الارا نظموں میں شامل ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' عنوان کی نظم میں ڈاکٹر شریعتی کے سچے پیشرو کی حیثیت سے کی ہے۔ پہلے کمیونزم کے عہد شباب میں ہی اس کے جلد زوال پذیر ہونے کی بات آج رونما ہو گئے ہوئے حقایق کے عین مطابق ابلیس سے یوں کہلوائی گئی

ہے۔

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشان روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جسکی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

ازاں بعد علامہ اقبال ابلیس کو اپنے مشیروں کی مختلف رائیں سن لینے کے بعد ان سے بوالپسی یوں ہمکلام ہوتے دکھاتے ہیں۔

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآن نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دین

جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستین

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

الحذر آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفرین

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کیلئے
نے کوئی فغفور و خاقان، نے فقیرِ رہ نشین

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امین

اس سے بڑھکر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمین

چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقین

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتابِ حق کی تاویلات میں الجھا رہے

علامہ اقبال کی طرح مسلمانوں کو قرآن سمجھنے اور عمل میں لانے کی حکیمانہ گذارشات کئی ڈھنگ سے کرنیوالے ڈاکٹر شریعتی قرآنی اصطلاحوں کو مصرف میں لانے کے آداب سکھا کر ان میں Islamization of Knowledge کا شعور پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو یہ بات سمجھانے کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ جس طرح ایک جاری جہاد کے دوران تمام فرد اپنی بساط کے مطابق اپنا چھوٹا یا بڑا حصہ ادا کر سکتے ہیں بالکل اسی طرح سے ہر مسلمان دانشور مختلف شعبہ ہائے علم میں اپنی اپنی

مہارت اور سپیشلائزیشن کے مطابق قرآن کی روشنی پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کر سکتا ہے۔

علامہ اقبال کی طرح مسلم دانشوروں اور طالب علموں کے سامنے ایسی تشخص نواز اور تقدیر ساز تجاویز پیش کرنے کے سماجی محرکات ڈاکٹر علی شریعتی جیسے بسیار شیوہ ماہرِ سماجیات کے لئے کس نوعیت کے تھے انکی زور آزمائی کے دو محاذوں کا نقشہ آپ نے "ماشین دراسارت ماشنیمؑ نام کے کتابچے میں بڑی دلسوزی سے کھینچا ہے۔ میں ڈاکٹر یونس جعفری کے ذریعے کرائے گئے اس کے اُردو ترجمے سے چند سطور کا انتخاب کر کے یہ مقالہ ختم کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ لکھا ہے "ہم اسلامی ممالک کے مفکرین اور تیسری دنیا کے تمام دانشور ایک بڑے ہی دُشوار گذار انتخاب سے دو چار ہیں..... یہ انتخاب ہمیں قطبین کے درمیان کرنا ہے۔ ایک قطب وہ ہے جس کا نام رسم ورواج ہے جو ہمیں ماضی سے بطور ورثہ ملا ہے۔ دوسرا قطب تقلید ہے جسے ہم نے موجودہ صدی میں یورپی تمدن سے ربط پیدا ہونے کے نتیجے میں مغرب سے حاصل کیا ہے.....

ہمارے عوام رسم ورواج کے ایسے صاف ستھرے دسترخوان پر بیٹھے ہیں جس پر انواع و اقسام کے کھانے چُنے ہوئے ہیں یہ پکے پکائے رسم ورواج کے کھانے ایسے ہیں جن کا انتخاب پہلے ہی کیا جا چکا ہے عوام کو انہیں بس قبول کر لینا ہے پھر وہی ان کے نگہبان بنتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے نیم روشن فکر تعلیم یافتہ طبقے کے پاس بھی مغرب سے تکنیکی اصول کے مطابق خوبصورت کاغذوں میں لپٹا ہوا استعمال کا سامان مہر بند ڈبوں میں آ جاتا ہے۔ اس طبقے کا کام بس اتنا ہے کہ ان ڈبوں کو کھولے اور مصرف میں لا کر ان کا چلتا پھرتا اشتہار بن جائے..... یہ طبقہ کسی ڈبے پر تحقیق کئے بغیر اس کا حامی اور نگہبان بھی بن جاتا ہے۔ کیونکہ بظاہر آپس میں متضاد دکھائی دینے والی مختلف مغربی کمپنیوں کا مشترکہ ہدف یہ ہے کہ مشرق کا جوان خود آگاہ بننے کے آداب سے محروم ہی

رہے..... لیکن مذکورہ دو قطبین کے درمیان کچھ ہم جیسے گستاخ بلکہ مہربانوں کی اصطلاح میں گمراہ اور باغی روشن فکر بھی ہیں' جو مغرب سے درآمد کئے گئے ڈبہ بند افکار و خیالات کو استعمال کرنے پر آمادہ نہیں۔ کیونکہ یہ گستاخ لوگ چاہتے ہیں کہ خود سوچیں' خود اپنے افکار سے اپنی تعمیر کریں..... مغرب جو کچھ اس طبقے سے کہلانا چاہتا ہے' وہ اس کو نہیں کہتا۔ یہی نہیں بلکہ وہ تو مغرب کی باتوں پر کھل کر اعتراض بھی کرتا ہے۔ یہ طبقہ اس بات کا بھی خواہش مند ہے کہ اپنے معاشرے کے مسائل سے متعلق اس مکتبہ فکر کا اعلان بھی خود کرے جس پر وہ یقین رکھتا ہے۔ نیز وہ مکتبِ فکر اس کے عوام کے دکھ درد اس کے وسائل و امکانات اور اس کی اپنی تاریخ و تہذیب پر قائم ہو''۔

خواتین و حضرات میں آپ کو مرحوم شریعتی کے یہ الفاظ علامہ اقبال کے فلسفہ خودی کے تناظر میں پرکھنے کی دعوت دیکر خدا حافظ کہتا ہوں۔ اللہ نگہبان

☆☆☆

اقبال کے ایک کشمیری عاشق کا حاصلِ مُطالعہ

(خواجہ محمد امین بڑھ مرحوم نے اپنی پچپن سالہ زندگی کا جو حاصلِ مطالعہ مواد ضخیم نو۹ یادداشتوں میں جمع کر کے رکھا ہے اس کے انتخاب پر مشتمل بڑا حصہ میں نے اقبال اکیڈمی کی استدعا پر ''خزینۂ امین'' کے نام سے ترتیب دیا ہے جو اُن کے فرزند خواجہ شاہد بڑھ کی کوششوں سے ۱۹۹۶ء کے دوران منظر عام پر آچکا ہے۔ یہ مضمون ''بیادگارِ امین'' کے علاوہ اُس (خزینہ) میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ وہاں ہیئت پر توجہ چاہنے کے ناطے اس کا عنوان ''خزینۂ امین کا ایک جُزوی تعارف'' رکھا گیا ہے۔ البتہ یہاں مواد پر تاکیدی توجہ چاہنے کے ناطے عنوان بدلا گیا ہے ہر چند کہ مواد میں کوئی تبدیلی نہیں لائی گئی۔)

اقبال اکیڈیمی کے ایک بُزرگ رُکن خواجہ محمد امین بڑھ کو رحمت حق ہوئے ابھی دوسرا مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ مجھے انکے سوگوار خاندان کے ساتھ ایک دو گھنٹے مل بیٹھنے اور مرحوم کی یادگار چھوڑی ہوئی گرانقدر تحریرات کو ایک نظر دیکھنے کا موقعہ میسر ہو گیا۔ ایک دل خوش کن ضیافت طبع اس ڈھنگ سے بہم پہنچانے کیلئے میں اپنے دو قدر دانوں اور یونیورسٹی کے دو قابل استادوں یعنی پروفیسر غلام رسول ملک صاحب اور ڈاکٹر بشیر احمد نحوی صاحب کا ممنون ہوں جنہوں نے اقبال اکیڈیمی کے لایق وفایق صدر اور سیکرٹری کی حیثیت سے ایسی نشست کا پروگرام ترتیب دے کر مجھے ایک مہمان خصوصی کی حیثیت سے اور اکیڈمی کے ایک رکن کی حیثیت سے شرفِ سربراہی بخشا۔ ہم نے وہاں ایک اور سرگرم رکن جی' ایم واعظ صاحب سمیت مرحوم بڑھ صاحب کی پچپن سالہ تحریرات

کونو ایسی جلدوں پر مشتمل پایا جن کو جدید اصطلاح میں نوڈائریاں کہہ کر بھی یاد کیا جا سکتا ہے۔ لیکن چونکہ ان میں درج تحریرات گذشتہ نصف صدی کے کشمیر کی ثقافتی اور سیاسی زندگی کا بلیغ تعارف کرنے کے علاوہ خود تحریر کرنے والے کے اعلیٰ مطالعے کی آئینہ داری بھی کرتی ہیں اس لئے ہم نے باتفاق رائے ان یادداشتوں کے مجموعے کو ''خزینۂ امین'' نام رکھا۔ اس نام کی مزید وضاحت کرنے سے پہلے یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک شائستہ، شریف النفس، خوش پوش اور خوش وضع شہری کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ علم و ادب کی سنجیدہ محفلوں کے ایک شیفتہ وشیدا کی حیثیت سے بھی مرحوم محمد امین بڑھ گذشتہ کئی دہائیوں کے دوران سرینگر کے اکثر علمی حلقوں میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ فارسی زبان وادب کی مہارت کے علاوہ آپ کو انگریزی اور اُردو پر بھی یکساں دسترس حاصل تھی۔ مشہور بڑھ خاندان[1] کے اس چشم و چراغ نے دیگر خواجہ زادگاں کی طرح اپنی عمرِ عزیز کو دولت وثروت کی ریل پیل کے ہاں رہن رکھنا گوارا نہ کیا۔ اس ریل پیل میں اکثر گم ہو جانے والوں کے برعکس آپ نے ایک دردمند مسلمان اور ایک خودشناس کشمیری کی حیثیت سے اپنے عرصہ حیات کے بڑے حصے کو بساط بھر ملّی اور علمی خدمت انجام دینے کیلئے وقف رکھا۔ یہ راسخ العقیدہ صحافی اور قلمکار خداشناسی، ملت شناسی اور خودشناسی کی راہ آیندہ نسلوں کیلئے روشن تر بنانے کی غرض سے ہمہ وقت مصروفِ مطالعہ رہا ہے اور اربابِ نظر کا فیضان عام کرنے کی غرض سے وہ مولانا رومی اور علامہ اقبال جیسے ملی شعور کے معماروں کی تعمیری فکر ونظر کے موتی اپنی جنبیلِ خوشہ چینی میں برابر جمع کرتا گیا ہے۔ مرحوم بڑھ صاحب اپنے اس دفتر دردوسوز کو ۷۸ سالہ زندگی کے آخری برسوں تک اسلاف کا نورِ بصیرت عام کرنے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی غرض سے تحریر کرتے رہے اور یوں مورخ محمد الدین فوق جیسے دردمند کشمیریوں کی فہرست میں شامل ہوتے گئے۔ بڑھ صاحب کا ذکرِ خیر آگے بڑھانے

سے پہلے ایک ممکنہ غلط فہمی کا پیشگی ازالہ کرنا چاہوں گا۔ میں نے اس مضمون کے حاشیے میں فوق صاحب کی صرف ذات شماری کو تلخ تنقید کا ہدف بنایا ہے ورنہ میں ان کی لگن اور شوقِ مطالعہ کا ہمیشہ دل سے قدردان رہا ہوں۔ اگرچہ محض ملی زاویہ نگاہ سے تنقید کرتے وقت بھی مجھے میرزا غالبؔ کا یہ مشورہ برابر یاد آتا رہا کہ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو۔ لیکن کسی فرد یا خاندان کی نسبی مدح گستری سے بچتے رہنے کی غرض سے ذاتی طور پر مجھے نظامی گنجوی کا یہ رویہ ہی بہتر مشورہ دکھائی دیتا ہے کہ

صاحبدلان خوشامدِ شاہان نہ کردہ اند آئینہ عیب پوشِ سکندر نمے شود

بہر حال اس ضمنی بات سے قطعِ نظر آپ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ اقبال اکیڈیمی نے ''خزینہ امین'' کی جلد ترتیب و اشاعت کے سلسلے میں چند عمدہ فیصلے کئے ہیں جن کو مناسب وقت پر مشتہر کیا جائے گا۔ یہ بات بتادی گئی کہ اس یادداشتی سلسلے میں خواجہ محمد امین برڑھ مرحوم کی ۱۹۳۷ء سے ۱۹۹۲ء تک ضبطِ تحریر میں آئی ہوئیں چیزیں شامل ہیں۔ ایک عبوری دور سے عبارت پچپن سال کے دوران وقتاً فوقتاً لکھی گئیں ان نو جلدوں کی جداگانہ تاریخوں کو حسب ذیل طریقہ پر پیریا ڈیکل یا عہد بعہد کی نشاندہی میں لایا جاسکتا ہے:۔

خزینۂ امین میں شامل یادداشتوں کی پہلی جلد کا اولین صفحہ ۲۴ ستمبر ۱۹۳۷ء کے روز اور آخری صفحہ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کے روز تحریر کیا گیا ہے۔ ۱۹۳۷ء میرا سال ولادت ہونے کے ناطے صرف میرے لئے ہی دلچسپی کا سبب نہیں ہے بلکہ ان سب کیلئے یہ سال دلچسپی کا سامان اپنی گرہ میں چھپائے بیٹھا ہے جو برِصغیر ہند میں ایک الگ وطن مانگنے والے مسلمانوں کے خاص تقاضا کو علامہ اقبال کے ذہن کی پیداوار سمجھنے میں یقین رکھتے ہیں۔ اور جو ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے پیش کی گئی اقبال کی قرارداد الہ آباد کے اس کلیدی جملے سے واقف ہیں کہ

" I THEREFORE DEMAND FORMATION OF A CONSOLIDATED MUSLIM STATE IN THE BEST INTEREST OF INDIA AND ISLAM."

یا جو محمد علی جناح اور ابوالکلام آزاد کے نظریات میں پائی جانے والی بنیادی تفاوت کو جاننے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اسی طرح سے خزینۂ امین کی اس اولین دستیاب جلد کے خاتمے کی تاریخ ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء نابغہ روزگار شاعر مشرق حکیم الامت علامہ اقبال کی تاریخِ وفات ہونے کے ناطے خصوصی تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ قبل الذکر سال اور بعد الذکر تاریخ سے متعلق دو انگریزی اقتباس خزینہ کی دوسری جلد کا تفصیلی تعارف پیش کرنے سے پہلے ہی نذر ناظرین کئے جائیں گے۔ اقبال اکیڈمی کی سطح پر خزینہ کی پیش نظر ترتیب و اشاعت جلد ہی یقینی بنانے کی غرض سے ہم نے اس اولین جلد کے ٹائیٹل کور پر لال سیاہی سے انگریزی گنتی کا جلی 1 بطور خاص نمبر لکھوایا ہے۔ اسلامی کلینڈر کے رو سے یہ جلد بڑھ صاحب کے ۱۷/شعبان المعظم ۱۳۵۶ھ سے ۲۰/صفر المظفر ۱۳۵۷ھ تک کے منتخباتِ مطالعہ پر مُشتمل ہے۔

خزینۂ امین کی دوسری جلد میں درج عبارات کا عرصۂ تحریر ۲۸/اکتوبر ۱۹۵۵ء سے ۲۳/نومبر ۱۹۶۷ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس جلد میں شامل اُردو فارسی اور انگریزی منتخباتِ مطالعہ اور تاثراتِ مؤلف فکر انگیزی اور بوقلمونی کے اعتبار سے نمایندہ حیثیت کے حامل ہیں۔ گویا اس ایک جلد کے تعارف و تجزیے سے دوسری تمام جلدوں کے موضوعات مواد اور نقد و تبصرے کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ''دِلکشا'' میں منعقد کی گئی نشست کے خاتمے پر انفرادی رائے زنی کیلئے ایک ایک جلد اٹھاتے وقت میں نے ترجیحاً اسی جلد کو اٹھالیا جبکہ اس سے ماقبل والی جلد اقبال اکیڈمی کے صدر پروفیسر غلام

رسول ملک صاحب کوتفویض کی گئی موعود تفصیلی مطالعہ کا تاثر پیش کرنے سے پہلے میں زیر مطالعہ جلد 1A کی نمائندہ حیثیت کے تعلق سے فقط دو چھوٹے سے اقتباس یہاں پیش کرتا ہوں' اس جلد کے اردو حصے کا آغاز مرحوم بڑھ صاحب کی ان خود تعارفی سطروں سے ہوتا ہے۔ جن میں اپنی تحریرات کے مقاصد واہداف کا تعین ان الفاظ میں کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

''میرے منتخباتِ مطالعہ..... (بشمولِ) میرے اپنے تاثرات مطالعہ کے میری ذاتی ڈائری (بشکل) زندگی کی مختلف النوع نیرنگیوں کے تاثرات۔ یہ سب میں وقتاً فوقتاً قلمبند کرتا ہوں' دیانتداری کے ساتھ' بغیر کسی خوف اور جھجک کے' تاکہ میرے مرنے کے بعد یہی سامان میری ذاتی ملکیت ہو جو میرے گھر سے نکلے جس سے آگاہی ہو کہ میرے دن اور میری راتیں کیسے گزری ہیں۔ امی ن عفی اللہ عنہ''

۳۔ خزینۂ امین کی تیسری جلد کا عرصۂ تحریر ۹/دسمبر ۱۹۶۷ء سے ۲۵/اپریل ۱۹۶۹ء تک پھیلا ہوا ہے

۴۔ خزینۂ امین کی چوتھی جلد کی تحریرات ۲۵/اپریل ۱۹۶۹ء سے شروع ہو کر ۶/مارچ ۱۹۷۰ء کو خاتمہ پذیر ہوتی ہے۔

۵۔ خزینۂ امین میں شامل پانچویں جلد بڑھ صاحب کے منتخبات اور تاثرات درمیان عرصہ ۱۵/اپریل ۱۹۷۰ء تا ۲۵/ستمبر ۱۹۷۰ء پر مشتمل ہے۔

۶۔ خزینہ مذکور کی چھٹی جلد میں ۱۵/مئی ۱۹۷۹ء سے ۱۷/نومبر ۱۹۸۱ء تک کی منتخبہ عبارتیں محفوظ کر لی گئی ہیں۔

۷۔ خزینۂ امین میں شامل ساتویں جلد کا عرصہ تحریر ۱۵/نومبر ۱۹۸۱ء سے ۳/جولائی ۱۹۸۵ء تک پھیلا ہوا ہے۔

۸۔ خزینۂ امین کی آٹھویں جلد میں شامل اشعار اور اقتباسات کا اندراج ۹/ اکتوبر ۱۹۸۵ء اور ۲۰/ دسمبر ۱۹۸۷ء کے درمیان میں وقتاً فوقتاً کیا گیا ہے۔

۹۔ خزینہ مذکور کی نویں جلد کے طور پر جلد کے اندراجات کا عرصہ یکم جنوری ۱۹۸۸ء اکتیس اگست ۱۹۹۲ء تک پھیلا ہوا ہے۔

اگرچہ خزینۂ امین کی نو دستیاب جلدوں کا مشترکہ حاوی موضوع اقبالیات سے متعلق منتخبات اور تاثرات پر مشتمل ہے تاہم ان جلدوں کے ذیلی موضوعات میں اشعار و تشریحات' اور کشمیریات کو بھی خاص مقام حاصل ہو گیا ہے۔ ان مختلف النوع منتخبات کی رنگینی کا ایک بوقلمون منظر نامہ پیش کرنے کیلئے چند اقتباسات اور تاثرات کی بازنمائی کرنے سے مفر ممکن ہی نہیں ہے۔ البتہ یہ جزوی تعارف تحریر کرتے وقت خالصتاً خزینہ مذکور کی دوسری جلد کے اقتباسات پر انحصار کیا گیا ہے اس توقع کے ساتھ کہ تمام جلدوں کے حسن و قبح کا اندازہ اس ایک ہی جلد کے تحصیلِ حاصل کی پیش کش پر غور کرنے سے بھی بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔

خزینۂ امین کی زیرِ نظر جلد (1A) ضخامت میں دوسری تمام جلدوں سے بڑی ہے۔ اس کا حجم "1"x6"x12.1/2 ہے۔ یعنی اس کی لمبائی "12.1/2 انچ' اسکی چوڑائی 6 انچ اور اسکی موٹائی ایک انچ ہے۔ موٹی جلد والی یہ دلچسپ دستاویز عام رجسٹروں کے برعکس ایک نادر اور کامیاب طرز کے روزنامچے کی تحریر کیلئے بنائی گئی رجسٹر ہے۔ چنانچہ بائیں طرف سے اس کے تقریباً ۱۲۸ صفحے انگریزی ابجد کی صفحاتی ترتیب کے حاشیوں A/B/C سے ترتیب دیئے گئے ہیں ازاں بعد بقیہ یادداشت کیلئے انگریزی گنتی کے جلی عددوں والے ۱۵۰ صفحات سبز مایل لکیر دار موٹے کاغذ کے رکھے گئے ہیں۔ اس جلد کے پورے ۲۷۸ صفحے خواجہ محمد امین بڑھ مرحوم کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے ہیں۔ نہایت خوبصورت عبارت اور عالمانہ دستخط میں لکھے گئے ان صفحات

کیلئے ایک ہی قلم اور ایک ہی سیاہی (PARKER BLUE BLACK INK)) کا استعمال کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ جلد بڑھ مرحوم کے علم و فضل، افتادِ طبع، ریاضت و مشقت اور سلیقہ و نفاست کی بہت اچھی آئینہ داری کرتی ہے اور ان کے منتخبات کی وسعت و رنگینی کا بخوبی اندازہ کراتی ہے۔ گویا اس ایک ہی جلد کے جام جم سے برآمد ہونے والے جلوے بڑھ صاحب کے معاصر کشمیریوں کے علاوہ برصغیر کی جدید تاریخ ساز شخصیتوں کو پہچاننے میں بھی اتنے ہی مفید و معاون دکھائی دیتے ہیں جتنے یہ جلوے سرزمین مشرق کے بعض قدیم ثقافت نواز شاعروں اور ادیبوں کو پہچاننے میں محسوس ہوتے ہیں۔ مثلاً برصغیر کے مسلمانوں کی جدید تاریخ کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والے قائداعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبالؔ جیسے قدآور لوگ۔ پہلے اگر یہ دیکھنا مقصود ہو کہ علامہ اقبال اور قائداعظم ایک دوسرے کو کس نظر سے دیکھتے تھے تو بڑھ صاحب کے فراہم کردہ ان الفاظ پر غور کرنا کافی ہوگا۔

ایک سچے عاشق اقبال کی حیثیت سے مرحوم بڑھ صاحب جہاں شاعر مشرق کے محبوب مکتبِ فکر کے ہر گوشے پر پڑنے والی روشنی کی طرف پروانہ وار لپکتے رہے ہیں۔ وہاں مخالفِ مکتب فکر کی کوتاہی اور قباحت کو بھی نشاندہی میں لاتے رہے ہیں۔ مثلاً علامہ اقبالؔ پر جو اعلیٰ معیار کا تحقیقی اور علمی کام ڈاکٹر یوسف حسین خان کی روحِ اقبال، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی فکرِ اقبالؔ، سید عبداللہ کی تصنیف "رومی اور اقبالؔ" یا نیاز الدین خان کی تالیفِ "مکاتیب اقبال" کی شکل میں منظر عام پر آتا گیا ان کا جوہر بڑھ صاحب نے اپنی یادداشت کی اس جلد میں شہد کی مکھی کی طرح یکجا کرلیا ہے۔ لیکن مخالفِ مکتب فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ کی غرض سے ابوالکلام آزاد کی تالیف "تذکرہ" اور اس کی "انڈیا ونز فریڈم" کے اُردو ترجمہ یعنی رئیس احمد جعفری کی "آزادیٔ ہند" کا بھی غائر مطالعہ کیا ہے اور ان کے بعض الفاظ و اشعار کو بھی اس جلد میں جگہ دی ہے یہ اور بات ہے کہ وہ علامہ

اقبال اور قائداعظم کو اسلامی فکر کے صحت مند معماروں کا درجہ دے کر ابوالکلام آزاد کو مہرۂ اغیار قرار دینے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ مندرجہ بالا انگریزی سطور میں نظریاتِ اقبال و جناح کی ہم آہنگی سے متعلق ایک جھلک دکھانے کے بعد بزھ صاحب قائداعظم اور ابوالکلام کے نظریات میں پائے جانے والے بُعد کی ایک جھلک بھی اسی طرح کے حسنِ انتخاب سے دکھاتے ہیں۔ چنانچہ ۷/اگست ۱۹۶۷ء کے روزخزینۂ امین کے زیرِ نظر حصے (1A) میں لکھتے ہیں۔ ''جولائی ۱۹۴۰ء میں جب ہندوستان کے ہندو (غلبے والی) کانگریس نے ابوالکلام آزاد کو دکھاوے کیلئے اپنا صدر بنادیا تھا اور اسے کہا تھا کہ تم مسلم لیگ سے بات چیت شروع کردو۔ تاکہ دنیا یہ دیکھ لے کہ ہندو کانگریس کا صدر ایک مسلمان ہے اور مسلم لیگ کا یہ دعویٰ صرف وہی جماعت مسلمانوں کی نمائندہ ہوسکتی ہے جھوٹ قرار دیا جاسکے..... تو ابوالکلام نے بصیغۂ راز قائدِاعظم کو اس معاملے سے متعلق ایک تار بھیجا جس کے تحت مسلم لیگ حکومتِ برطانیہ سے اصرار کررہی تھی کہ دوقومی نظریے کی بنیاد پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے مساوی حقوق تسلیم کر کے ایک عبوری حکومت بنادی جائے وہی حکومت باقی معاملات طے کرے گی تار کا مقصد بزھ صاحب کی نظر میں ایک دامِ فریب پھیلانے کا مقصد تھا گویا ایک معاہدے کی آڑ میں مسلم لیگ کو کانگریس کی ایک شاخ بنا کر پیش کرنا اور اس کی حاصل کردہ اہمیت پر شبخون مارنا مقصود تھا۔ یہی حقیقت تاڑنے کے سبب جرأت ایمانی سے لیس قایداعظم نے ابوالکلام کو یہ تُرش جواب ارسال کیا تھا۔

برصغیر کی سیاست سے متعلق تلخ نوائی پر مبنی اسی طرح کے بعض واقعات مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو، بلراج مدھوک اور شیخ عبداللہ کے حوالے سے بہم کرنے کے باوجود بزھ صاحب نے اپنی یادداشت کا بیشتر حصہ شعروادب کیلئے ہی وقف کرلیا ہے۔ وہ بھی خصوصاً اقبال شناسی کی راہ روشن کرنیوالے شعروادب کیلئے۔ البتہ اس دائرے میں نہ

آنیوالی کتابوں پر تبصرہ کرتے وقت بھی مرحوم بڑھ صاحب پوری دیانتداری اور غیر جانبداری سے نقد ونظر کا حق ادا کرتے ہیں۔ وہ علامہ اقبال کی فارسی تصنیفات اسرارِ خودی، رموزِ بیخودی، پیامِ مشرق، زبورِ عجم۔ پس چہ باید کرو۔ مسافر۔ جاوید نامہ اور ارمغانِ حجاز کے اشعار منتخب کرتے ہوئے دوسری کئی کتابوں پر بھی اپنے بے لاگ تاثرات قلمبند کرتے گئے ہیں۔ مثلاً خزینۂ امین کی اسی جلد (1A) کے منتخبات مطالعہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی کی نفسیات سے متعلق تصنیف ''ہم آپ'' غلام رسول مہر کی تالیف ''سید احمد شہید'' پروفیسر اکرام کی ''کلچرل ہیریٹج آف پاکستان ٹونیشنز اینڈ کشمیر آف بروڈوڈ'' ''دی میموریس آف آغا خان'' اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی ''فرینڈس ناٹ ماسٹرس'' جیسی کتابوں پر رائے زنی کرتے وقت بھی محمد امین بڑھ انصاف واعتدال سے کام لیتے ہیں۔ البتہ جہاں وہ کسی قلمکار کو ذہنی افلاس، اخلاقی پستی اور جنسی بے راہ روی کا آلۂ کار یا پرچارک بنتے دیکھتے ہیں وہاں اس کو فوری طور پر آڑے ہاتھوں لینے سے کبھی نہیں چوکتے بڑھ صاحب کے اس غازیانہ رویہ کی ایک ٹھوس مثال اخبار سندیش کے نائب مدیر اور جموں کے ایک صحافی نما ناول نویس موہن یاور کے ''سیاہ تاج محل'' نامی سیاہ کارنامے پر آپ کی وہ بے لاگ تنقید ہے جو ۱۰ر مئی ۱۹۶۲ء کے اخبار خدمت میں منظر عام آگئی ہے۔ نمونے کے طور پر اس تنقید کی یہ چند سطریں ''خزینہ امین'' جلد 1A کے صفحات ۴۷، ۴۸، ۴۹ سے نقل کر کے پیش کی جاتی ہیں۔ ''سیاہ تاج محل جموں کے ایک جرنلسٹ افسانہ نویس کے بارہ افسانوں یا سیاہ کارناموں کا ایک مجموعہ ہے، افسانوں کی زبان کمزور اور پھسپھسی بلکہ غلطیوں سے پُر ہے..... علامہ اقبال پر بے پایاں رحمت ہو۔ کیا خوب فرما گئے ہیں ؎

ہند کے شاعر وصورت گر وافسانہ نویس آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

انہی افسانہ نویسوں میں ''سیاہ تاج محل'' لکھنے والے کا شمار ہوسکتا ہے۔ جس

کے اعصاب پر عورت بری طرح سوار ہے اور وہ بھی ایک بد کار ننگِ وطن اور ننگِ انسانیت آوارہ عورت.......... افسانہ نویس کھلے بندوں آوارہ گی، بدمعاشی اور بد چلنی کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ اس کا قلم زِنا کو عام کرنے کیلئے بے قرار ہے۔ وہ قوم کی نوخیز اور جواں سال لڑکیوں کو آوارگی کے گر سکھلاتا ہے اور یہ کہ وہ شادی بیاہ کے ''پوتر بندھن'' میں اپنے آپکو پابند نہ کریں.......... مائیں نہ بنیں۔ بچے نہ جنیں بلکہ.......... جنسی آزادی کو برقرار رکھ کر خوشنما چڑیوں کی طرح ٹہنی ٹہنی پر چہکیں اور جہاں کوئی تناور پیڑ نظر آئے وہاں تھوڑی دیر کیلئے آشیانہ بنائیں اور جنسی پیاس کو بجھا کر' اپنے جی کو بہلا کر پھر دوسرے پیڑ پر چلی جائیں.......... خدا نہ کرے کہ اس جیسے افسانہ نویس کی بے تکی باتوں پر کوئی کان دھرے ورنہ عزت' آدمیت اور بقائی نسل انسانی کا انقطاع یقینی بن جائے گا اور مشرق کے قابلِ صد ناز تہذیب و تمدن کا خاتمہ ہوگا ہماری تہذیب کا لب لباب یہ ہے کہ ۔

سترِ زَن یا زوج یا خاکِ لحد　　سترِ مردان حفظِ خود ازیارِ بد

''یہ الفاظ لکھنے کے بعد بڈھ صاحب مذکورہ ناول کے چار اقتباس پیش کر کے موہن یاور کی آوارہ ذہنی کو طشت از بام کرتے ہیں اور اپنے تبصرے کو دو آتشہ بنانے کے لئے لمبی آہ بھر کر لکھتے ہیں'' یہ ہیں ہمارے افسانہ نویس جو سماج کے اخلاق کو سنوارنے کے ٹھیکیدار بنے بیٹھے ہیں اور جو دراصل قابلِ صد نفریں زِنا نواز تمدن کے نمائندے ہیں۔ ان کی عریاں نویسی ہی ذمہ دار ہے سماج میں اخلاقی برائیوں کی' جنسی بے راہ روی کی' ملک میں تہذیبی گراوٹ کی اور قوم میں پستیٔ کردار کی۔ تفوٗ بر تو اے چرخِ گرداں تفوٗ۔ یہی لکھنے والے ہیں جو واقعاً۔

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند　　کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل اُن کا　　اُنکے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

بُرے قلمکاروں کی زہریلی تحریروں سے بچنے اور اچھے قلمکاروں کی روح نواز تحریروں سے فیضیاب ہونیکی کوشش کرتے رہنے کا جو مشورہ مرشدِ مرشدان مولانا رومی نے حق کے ہر متلاشی کو ان الفاظ میں دیا ہے ۔

دستِ ہرنا اہل بیمارت کُند سوے مادر آ کہ تیمارت کند

اسی مشورے کی پذیرائی کر کے مرحوم محمد امین بٹ نے اچھے شاعروں کے اشعار بڑی عقیدت اور حُسنِ ظن سے منتخب کرتے رہے ہیں چنانچہ مرزا غالبؔ کے اس تجربے کے باوصف کہ ـ ''شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے'' وہ ایک گونہ حُسنِ انتخاب کو اپنے خزینہ میں بڑی خوبی سے یکجا کر سکے ہیں' کئی اشعار ایک سے زیادہ بار بھی نقل کئے گئے ہیں تاہم بٹ صاحب کے ذوقِ سلیم اور معیارِ شعر شناسی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کس پایئے کے شاعروں کا زرِگل اپنے کشکول میں جمع کر لیا ہے۔ خزینۂ امین کی زیرِ نظر جلد (1A) کے مطالعے سے بھی ان کے محبوب شاعروں کا پتہ چل جاتا ہے۔ چنانچہ اُس جلد میں فارسی' اُردو اور کشمیری کے جن شاعروں کا منتخبہ کلام درج کیا گیا ہے۔ ان میں یہ سب نام شامل ہیں۔ حکیم سنائیؒ' مولانا رومیؒ' شیخ سعدیؒ' امیر خسروؒ' حافظ شیرازیؒ' مولانا جامیؒ' پیر پیران سید عبدالقادر جیلانیؒ' خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ' خواجہ معین الدین چشتیؒ' خاقانیؔ' عراقیؔ' منوچہریؔ' ظہوریؔ' عرفیؔ' نظیریؔ' میرزا بیدلؔ' میر تقی میرؔ' قدسیؔ' عزت بخاری' مولانا حالیؔ' اکبر الہ آبادیؔ' غنی کشمیریؔ' شیخ سرمدؔ' وصالیؔ' گرامی علامہ اقبالؔ' حفیظ جالندھریؔ' مولانا ظفر علی خانؔ' مرزا محتشم خان فداؔ' حسرت دہلوی' عابد علی عابدؔ' فیض احمد فیضؔ' جوش ملیح آبادی' جگر مراد آبادی' جگن ناتھ آزادؔ' مولانا حیرت کاملی' میر غلام رسول نازکی' سید مبارک شاہ فطرتؔ گیلانی' عبدالحق برقؔ' پیر عبدالقادر آثمؔ' آنند نرائن مُلا اور صرفی کشمیری ان سب شاعروں کے منتخب کیے گئے اشعار جہاں مرحوم بٹ صاحب کی خاص اُفتادِ طبع' خاص شعر شناسی اور خاص معرفتِ نفس کا

باوقار مظاہرہ کرتے ہیں وہاں ان شعروں کو آپکے تاثرات کے سمیت اپنی اصل صورت میں پڑھنا کچھ اور ہی لطف دیتا ہے] اس لطف میں شریک ہونے کیلئے ہمارے قارئین کو خزینۂ امین کے بالاقساط منظر عام پر آنے تک انتظار کرنا ہوگا بلکہ ان تاثرات سے محظوظ ہونے کیلئے بھی جن کو بڑھ صاحب نے 1A میں یہ عنون دیئے ہیں۔ جناح کا خلوص' چھا گلا کا جھوٹ (ص s) خضر سوچتا ہے..... (ص 3) مسلمانوں کا کوئی ہمدرد نہیں' جدید ہندوستان کی بے حیائی' ہولناک جنگ' شیخ عبداللہ کا اظہار' جن سنگھ کی دُرگت' ہندوؤں کی سیاست۔ بہر حال طوالت سے بچنے کیلئے میں اس جزوی تعارف کو چند ایسے نثری اقتباسوں پر ختم کرنا چاہوں گا۔ جو اقبال شناسی کے علاوہ کشمیر اور فلسطین جیسے مسائل سے متعلق بھی چند نازک باتوں کے چہروں سے پردے سرکاتے ہیں اور جو مرحوم بڑھ صاحب کے مختلف تجربات اور میلانات کی بھرپور عکاسی بھی کرتے ہیں۔ یہ چند اقتباس خزینۂ امین کی صرف جلد 1A سے لئے جاتے ہیں:۔

صرف پندرہ اقتباس مُلاحظہ کیجئے:۔

ا۔ اقبال نے مشرق و مغرب کو محض سیاسی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ عمرانی اور فکری زاویہ نگاہ سے بھی دیکھا۔ ایک ایسے دانائے راز کے زاویہ نگاہ سے جو زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتا ہے اور ماضی و حال کے تمام اہم سررشتوں کو ملا جلا کر ان سے اہم ترین بنیادی حقایق کا سراغ لگاتا اور آئندہ امکانات کی نشاندہی کرتا ہے۔ اقبال کا فکر صرف مشرق یا مغرب ہی نہیں بلکہ تمام نوعِ انسان کو محیط ہے (1A ص 148)

کل ۱۱ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو سرینگر ریڈیو سے ایک مجلسِ مشاعرہ کی کاروائی نشر کی گئی۔ مقامی حکومت اور بھارتی حکومت کے گیت گائے گئے اکثر شعراء نے قصیدہ خوانی کی اور اپنے آقایانِ ولی نعمت کی تعریفیں کر کے اپنی ''نمک حلالی'' کا ثبوت دیا۔ صرف ایک شاعر (نام بھول گیا ہوں) نے کشمیریوں کی واژگون حالت کا صحیح نقشہ ان تین

اشعار میں یوں کھینچا ہے :-

دم بخود ہیں پیمبرانِ بہار آتش آلودہ پیش و پس ہے وہی
ایک ہم ہیں چمن نصیبوں میں اپنے دامن میں خاروخس ہے وہی
دل کی دھڑکن جو زیرِ لب تھی کبھی کارواں کارواں جرس ہے وہی

میں نے پٹھانکوٹ میں بیٹھ کر وہ مُشاعرہ سنا یہ تین شہ پسند آئے اخبار پر پنسل سے نوٹ کئے آج وہاں سے واپس آیا اور یہاں درج کئے (ص ۱۴۴)

ii۔ یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

تصوف کے خیالات جو شاعری کے ذریعے اسلامی ملکوں میں پھیلے۔ اُن میں زندگی سے گریز (بھاگنے) کی تعلیم تھی..... اس کی نسبت علامہ اقبال نے (نثر میں بھی) اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:-

''یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولٹیکل اِنحطاط (زوال) کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ جس قوم میں طاقت اور توانائی مفقود ہو جائے۔ جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہوگئی تو پھر اُس قوم کا نقطہ نگاہ بدل جاتا ہے۔ اُس کے نزدیک ناتوانی حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دینا موجب تسکین۔ اس ترکِ دینا کے پردے میں قومیں اپنی سستی اور کاہلی اور اُس شکست کو جو اُن کو تنازعُ البقا۔ (STRUGGLE FOR SURVIVAL) میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ اُن کی ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا''۔

(اقبال نامہ ص ۴۴)(1A ص 133)

iii۔ اقبال نے ''اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل''

(RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM) میں آدم کے جنت سے نکالے جانے کی نہایت ہی بلیغ تفسیر پیش کی ہے وہ کہتا ہے کہ جنت میں آدم کی زندگی دراصل انسانیت کی اُس ابتدائی دور سے عبارت ہے۔ جبکہ اُس میں احساسِ خودی پیدا نہ ہوا تھا اور اس نے اپنے ارادہ وعلم کی قوت سے ماحول سے مطابقت کرنا نہیں سیکھا تھا اس کا دل آرزو اور احتیاج کی خلش سے بیگانہ تھا۔ یہ واقعہ دراصل اس حقیت کی یادگار ہے کہ کس طرح انسان نے اپنے جبلی میلانات کے دائرے سے باہر قدم نکالا اور ایک آزاد اور بااختیار ایغو (EGO) کا مالک بنا..... آدم کی نافرمانی اس کیلئے ایک سبق تھی۔ اس طرح اس نے اپنے اختیار وارادہ کو برتنا سیکھا۔ اس لئے اس کا قصور معاف کر دیا گیا۔ قرآن کریم میں اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا کہ بہشت سے نکلنے کے بعد دنیا آدم کیلئے کلفت وزحمت کی جگہ بنائی گئی تا کہ وہ اپنے گناہ کی سزا پائے۔ یہ تصور بالکل غیر اسلامی ہے اسلام کا بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس نے اخلاق کو زندگی کا محرک اور تاریخ کو انسانی اعمال کا فیصلہ قرار دیا۔ اسلام نے انفرادی ذمہ داری اور سعی وعمل کو زندگی کا اصلِ اصول قرار دیا۔ عمل سے ہی انسان کی ظاہری اور باطنی خوبیاں نمایاں ہوتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو ملائیکہ کا مسجود ہونے کا مستحق ثابت کرسکتا ہے۔ (۱۸۔ص 130)

۵۔ محی الدین ابن عربی اور عبدالکریم جیلی نے انسان کامل کے تصور پر بحث کی ہے۔ جیلی نے اپنی کتاب ''الانسان الکامل فی معرفتہ الاواخروالاوایل'' میں یہ خیال پیش کیا ہے کہ انسان بجائے خود ایک عالم ہے۔ جو خدا اور فطرت دونوں کا مظہر ہے..... جیلی کا عقیدہ تھا کہ باوجودِ نیابتِ الٰہیہ کی اہلیت رکھنے کے انسان ذاتِ باری کی شانِ سرمدیت میں شریک نہیں ہوسکتا۔ جیلی عقیدہ حلول کا قائل نہ تھا۔ اس کے نزدیک ''انسانِ کامل'' عرض کی حدود سے نکل کر جوہر کے دائرے میں داخل ہو جاتا

ہے۔ اس کی آنکھ خدا کی آنکھ' اس کا کلام خدا کا کلام اور اس کی زندگی خدا کی زندگی بن جاتی ہے۔ اگر انسان اللہ کے ساتھ اپنی بندگی کے تعلق کو اس طرح استوار کرے کہ اس کے سارے افعال و اعمال میں خدا کے ہی مشاہدے اور حضور کی کیفیت حاصل ہو تو یہی عینِ دین ہے۔ تعبد میں تجرد کی ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جبکہ انسان ذاتِ واجب کے وجودِ علمی سے معمور ہو جاتا ہے۔ یہ شہود اس پر اس قدر حاوی ہو جاتا ہے کہ اس کا وجود الٰہی وجود بن جاتا ہے۔ اقبال اس خیال کو بالِ جبریل میں یوں پیش کرتا ہے

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات ہر دو جہاں سے غنی اُس کا دلِ بے نیاز

......اِنسانِ کامل اپنی سعی و عمل اور ضبطِ نفس کے مرحلوں سے گزر کر نیابت الٰہی کی ذمہ داریاں قبول کرتا ہے اور عناصر پر اپنی حکمرانی کا سکہ جماتا ہے......انسان کامل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اعجازِ عمل سے تجدیدِ حیات کرتا ہے۔ اس کی فکر زندگی کے خوابِ پریشان کی نئی تعبیر پیش کرتی ہے۔ وہ پرانی اِصطلاحوں کو نئے معنی پہناتا اور حقائق کی نئی توجیہہ پیش کرتا ہے۔ وہ تاریخ کی تخلیقی رو کو اپنے حسبِ منشاء جدھر چاہتا ہے موڑ دیتا ہے۔ اُس کے ذریعے انسانی صفاتِ عالیہ کا اظہار تاریخ میں اعلیٰ سیرت کی شکل میں ہوتا ہے......1A ص 126' 127

٦۔......ہالینڈ' فرانس' جنوبی امریکہ کے ممالک۔ کینیڈا' ہندوستان سب ممالک نے سلامتی کونسل میں اور سلامتی کونسل سے باہر اسرائیل کے نقطہ نظر کے ساتھ اتفاق کیا۔ امریکہ اور برطانیہ نے کھلے بندوں اس یہودی ملک (اسرائیل) کی معاونت کی۔ گویا عربوں یا مسلمانوں کا اللہ کے سوا کوئی حامی و ناصر نہیں ہے۔ (کرنل ناصر جیسے دین دشمنوں کی روش سے اُنکا شیرازہ ہی بکھر گیا ہے) مسلمان ممالک مثلاً پاکستان' ایران' ترکیہ اور انڈونیشیا نے عربوں کی اخلاقی مدد تو کی۔ لیکن مادی مدد دینے سے انہوں

نے قدرتی طور تامل سے کام لیا۔ کیونکہ اول تو (فلسطین اور یروشلم پر اسرائیل کے قابض ہونے کے) اس معاملہ کو اسلامی نظریہ کا حامل بنانے کی ناصر اور دوسرے عربوں (اقتدار پرستوں) نے سختی سے مخالفت کی تھی اور دوئم یہ کہ ناصر کی کج فہمی نے ساری دنیا کی دشمنی مول لی تھی، حالانکہ اسے پچھلے چند برسوں سے بہ اصرار کہا گیا تھا کہ عرب لیگ کا یورپی وطینت والا راگ الاپنا چھوڑ دو۔ اور سارے عالمِ اسلام کے ساتھ ناطہ جوڑ دو۔ عرب لیگ کو اسلام لیگ یا موتمرِ عالم اسلام میں بدل دو اور سارے مسلمان ممالک کے ساتھ متحد ہو جاؤ تا کہ ارضِ مقدس کو بچانے کا بالاتفاق اہتمام کیا جا سکے۔ (لیکن فرعونی نسل ہونے پر ناز کرنے والے اس پر وردۂ کفر سیاہ دل ناصر پر اور اُسکے معاصر نام نہاد مسلمان حکمرانوں پر اخوان المسلمین جیسی حق پرست تنظیموں کی اِس بات کا کوئی اثر نہ ہوا)۔

۷۔ لاکھوں نمرود ہوں، کروڑوں فرعون ہوں..... یا کھربوں ابوجہل ہوں ہم سنت ابراہیمی، سنت موسوی اور سنت محمدیؐ پر جادہ پیما ہو کر اُن سب شیطانوں اور ابلیسوں کو نیچا دکھائیں گے۔ انشاءاللہ۔ ہم نے آج تک بھی ہمیشہ دنیا کو دکھا دیا ہے کہ ہم باطل سے دبنے والے نہیں۔ تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں/ آسان نہیں مٹانا نام ونشان ہمارا۔ ہمارا کاروان آگے کو جا رہا ہے۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا نام اسلام ہے۔ ہماری کُنیت اسلام ہے۔ ہمارا وطن اسلام ہے۔ ہمارا مقصدِ حیات اسلام ہے۔ ہمارا حاصلِ دو جہاں اسلام ہے۔ ہم ایک منظم اور مربوط کاروان کے افراد ہیں ؎

سالارِ کارواں ہے میر حجازؐ اپنا اُس نام سے ہے باقی آرامِ جان ہمارا

وَصَلی اللہ علیٰ سَیِّدنا مُحمّدٍ وعلیٰ آلِ سَیِّدنا مُحمّدٍ وَ اصحابِ سَیِّدنا مُحمّدٍ وَبَارِکْ وَ سَلِمْ عَلَیْھِمْ۔ اِس وقت کشمیری مسلمان کربلا کے معرکے سے گزر رہے ہیں۔ ایک طرف نیرو جیسا یزیدِ لعین اور اس کی فوج صف آرا ہے اور دوسری طرف کشمیری مسلمانوں میں حسینی روح بیدار ہو رہی ہے اور

انشاءاللہ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد (۲۱ر جولائی ۱۹۶۱ء) مئی ۶۹

۸۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے ۱۹۴۶ء میں لارڈ ماونٹ بیٹن نے (قائد اعظم) محمد علی جناح کے متعلق رائے دریافت کی۔ پنڈت نہرو نے کہا کہ وہ ایک اوسط درجے کا وکیل ہے۔ ہندوستان کے وکیلوں میں اس کا کوئی ممتاز درجہ نہیں۔ البتہ چند سال سے اس نے ہندوستان کے مسلمانوں میں سے ایک گروہ کو اپنے ساتھ ملا کر ہندوستان کی سیاسیات میں گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ ہندو کی عادت ہے کہ وہ دوسروں کو حقیر اور ہیچ سمجھتے ہیں اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ہر معاملے میں شکست کھاتے ہیں اور ہر محاذ پر مار کھاتے ہیں..... جس لیڈر کو نہرو نے ایک معمولی وکیل بتایا۔ تاریخ نے دیکھ لیا کہ وہ کامیاب و کامران ہوا۔ حُسن نیت، حُسن تدبر اور حُسن عمل سے..... اس عظیم المرتبت قائِد نے مسلمانوں کو ایک الگ گھر بنا کے دیا..... گاندھی، نہرو، پٹیل، اور راجندر پرشاد سب ہندوؤں نے یہی کہا کہ پاکستان گو وجود میں آ گیا۔ لیکن اس کی عمر چھ ماہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ آج دنیا دیکھ رہی ہے کہ چودہ سال سے پاکستان ترقی کے منازل طے کر رہا ہے۔ اپنے مخصوص راستے پر گامزن ہے اپنے اسلامی موقف پر قائم ہے اور اقوامِ عالم میں ایک ممتاز درجے کا مالک ہے۔ ۲۲ر جولائی ۱۹۶۱ء (1/A صفحہ 75)

۹۔ جہانگیر نے ایک مصرعہ کہا دُرِ ابلق کسے کم دید موجود + مصاحبوں سے کہا دوسرا مصرعہ کہہ دو۔ کوئی کہہ نہ سکا پردے کی اوٹ سے نور جہاں بولی مگر اشکِ بُتانِ سرمہ آلود (1/A صفحہ 74)

۱۰۔ لکھنؤ شہر کے سب سے بڑے ہوٹل کارلٹن میں شہر کے معززین کا مجمع کئی سو کی تعداد میں ہے۔ ہندو مسلمان سب ہیں..... یوپی کی نئی لسانی کمیٹی کے صدر اچاریہ کرپلانی بھی جلوہ افروز ہیں اور یوپی کے چیف منسٹر گپتا جی بھی۔ بھلا لکھنؤ کی کوئی اجلی نستعلیق صحبت ہو اور اس میں شعر و شاعری نہ ہو۔ چائے نوشی کے بعد شعر خوانی کا دور بھی

چل رہا ہے۔ سب کان لگا کر سنتے ہیں ''مکرر'' ایک شعر کے بعد ہال اس آواز سے گونج اُٹھا اور مکرر ارشاد ہو کی صدائیں ہر طرف سے آنے لگیں۔ شعر یہ تھا۔

؎ دی ہے مجھے دو آبۂ گنگ و جمن نے جو زبان (اُردو) آج اُسی کو حکم ہے گنگ و جمن سے دُور دُور اور'' یہ کلام مُلّا کا ہے۔ کوئی مُلّائے مسجدی یا مُلّائے مکتبی نہیں بلکہ اردو کے قدیم پرستار یادگارِ نسیم و سرشار یوپی ہائی کورٹ کے جج جسٹس آنند نراین مُلا!'' (مولانا ماجد دریابادی۔ صدقِ جدید۔ ۲۸ر جولائی ۱۹۶۱ء (1/A ص 73)

۱۱۔ ۲۴ر شعبان المعظم ۱۳۸۱ھ مطابق ۳۰ر جنوری ۱۹۶۲ء یوم سہ شنبہ رات کے پورے سوا گیارہ بجے حضرت والد محترم قبلہ خواجہ صدر الدین بچھ ابنِ خواجہ عبد النبی بچھ صرف سات گھنٹے کی علالت کے بعد واصل بحق ہوئے اِنّا لِلّٰہِ و اِنا اِلیہِ راجِعُون۔ عرش آشیانی قبلہ والدِ محترم نے ہنستے ہنستے موت کو لبیک کہا۔ اللہ کا نام لے کر۔ یہ نامۂ سیاہ اُس وقت انکی خدمت اقدس میں حاضر تھا میں نے بچشم خود مردِ مؤمن کا وہ نشان دیکھا جس کے متعلق ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال نے کہا ہے چو موت آید تبسم بر لبِ اوست' حضرت والدِ محترم کی وصیت کے مطابق نمازِ جنازہ آستانہ نقشبندیہ پر ادا کی گئی اور پھر وہ اپنے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کئے گئے' حضرت والد محترم نقشبندیہ مسلک کے سالک تھے۔ حضرت بہاء الدین محمد نقشبند مُشکلکشا (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کو اپنا پیر طریقت سمجھتے تھے اور صحیح معنوں میں فنافی الشیخ تھے۔ جونہی وہ شاہِ بخارا رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی سنتے تھے تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے تھے اور بڑی دیر تک اُن پر ایک عجیب سرور انگیز کیفیت طاری ہو جاتی تھی (1/A ص 62)

۱۲۔

اہل کاران بہ وقتِ معزولی شبلیٔ وقت و بایزید شوند
باز چوں مے شوند بر سرِ کار شُمرِ ذِی الجوشن و یزید شوند

اِس بات کا ثبوت ہمیں کشمیر میں ۱۹۴۷ء سے تا حال سال بہ سال ملتا رہا ہے۔ معزولی کے وقت اہلکار (ایم ایل اے) نیک بندے اور عوام کے ایسے بہی خواہ بنتے پھرتے ہیں کہ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ لیکن جونہی پھر سے برسرکار ہو جاتے ہیں تو فوراً ان کا حال ایسا تبدیل ہو جاتا ہے کہ اُن جیسا ظالم، فرعون مزاج، نمرود صفت اور شیطان خصلت دنیا جہاں میں ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔ ۳۰/جولائی ۱۹۶۵ء (1/A ص 29)

۱۳۔ (۳۰/اپریل ۱۹۶۷ء کے روز مرحوم بڑھ صاحب 1/A کے صفحہ ۱۰ پر اپنے چھوٹے بھائی محمد یوسف بڑھ کو مرحوم عبدالحق برق کی جانب سے بھیجے گئے خط کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں) یوسف سلمہ اپنے وطنِ مالوف سے انیس سال سے دور رہ رہا ہے۔ وہ کشمیر سے ۱۹۴۷ء میں یہاں سے ظالم و جابر حکومتِ وقت کے حکم کے تحت پاکستان چلا گیا۔ ۱۹۵۳ء میں وہاں سے امریکہ چلا گیا۔ جب سے وہ وہاں رہ رہا ہے۔ ۱۹۶۷ء میں وہ بیت اللہ کی زیارت، حرم نبویؐ کی آستان بوسی اور فریضۂ حج ادا کرنے کیلئے سعودی عرب آ گیا۔ کشمیر سے اُن کی والدہ ماجدہ بھی فریضۂ حج ادا کرنے کیلئے چلی گئیں۔ اس طرح بیت اللہ اور وطنِ رسولؐ میں ماں بیٹے کی ملاقات انیس سال کے بعد ہوگئی دونوں ماں بیٹے اکٹھے چوون دن رہے اور اکٹھے فریضۂ حج ادا کیا۔ برق نے (مدینہ پاک میں قیام کے دوران) اپنے دوست یوسف سلمہٗ کو خط لکھا مختصر ترین اشعار پر مشتمل۔

خط گویا ہے۔ تشریح کا محتاج نہیں (ام ی ن)

۱۴۔..... یہ احساس کہ جوانی اور عالمِ شباب ضایع ہو گئے۔ پیری اور بڑھاپے میں تہی دستی ہے۔ سفید بالوں کے ساتھ روسیاہی کا عالم ہے۔ آج تک جیئے لیکن بے مقصد۔ صرف پیٹ کی فکر کی۔ تنورِ شکم کو گرم رکھا اور روح کی بالیدگی کا کوئی

سامان بہم نہیں کیا۔ یہ احساس شاید ندامت پر مبنی ہو اور اگر واقعی ندامت ہو جائے تو تھوڑی سی امید بندھ جائے گی کہ عرقِ ندامت سے عصیاں کے داغ دُھل جائیں گے اور اپنے خالق کے ہاں یہی عرقِ انفعال توشہ کے طور پیش کیا جا سکے۔ اِغفِر ذَنبی یَا غَفَّار...... ۲۳ر مئی ۱۹۶۲ء (1/A ص 47)

۱۵۔ پیر عبدالقادر آثم مرحوم ایک علمی پیرزادہ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے فارسی میں شاعری کی ہے اور خوب شعر کہے ہیں۔ مولانا حیرت کاملی کے ساتھ اُن کا اُٹھنا بیٹھنا بڑی مدت تک رہا۔ حیرت آثم کی شاعری کے مداح ہیں۔ آثم علم وفضل کے علاوہ دلِ پُر درد رکھتے تھے۔ اور ہر چیز کو غائر نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کی چند غزلیں سرینگر کے رسالہ گلریز (۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۵ء) میں شائع ہوئی ہیں۔ آثم کے دو صاحبزادے پیر غلام حسن اسٹنٹ رجسٹرار جموں و کشمیر یونیورسٹی اور پیر علی محمد لیکچرار زبان وادبیات انگریزی ہیں۔ اُن سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے والدِ مرحوم کا کلام جلد مرتب اور شائع کریں گے۔ تا کہ اربابِ ذوق اس سے استفادہ کر سکیں۔ نمونہ کلام

گل خواست تا برابرِ آن رُو شود نشُد   مہ کاست تا مقابلِ آنرو شود نشُد
آثم زِ کعبہ گشت روان سوے دیرتا   ہند وِی خالِ آن بُت ہندو شود نشُد

مرحوم بڑھ صاحب کی ۱۹۶۷ء میں فرزندانِ آثم کے ساتھ وابستہ کی گئی یہ توقع چھتیس سال گزرنے کے باوجود اب تک بھی پُوری نہ ہو سکی ہے!

●●●●●

مُصنّف کے چیدہ قلمی کام (مرغوبؔ تراجم، تصنیفات اور تالیفات)

- کلیلہ دِمن (نوشیروانِ عادل اور خلیفہ ہارون رشید کی کشمیری الاصل نصیحت آموز کہانیوں کی کتاب تانترا کھیا یک جس کی عربی اور فارسی نسخوں کے حوالے سے کشمیری میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ (کلچرل اکیڈمی پبلی کیشن ۱۹۷۵ء
- پرتوستان [اولین شعری مجموعہ (پہلا ایڈیشن.....۱۹۷۶ء
- مرغوبؔ تھیوری (موجودہ کشمیری رسم الخط اور کشمیری املا کی معیار بندی کے بیس اصول۔ کشمیر یونیورسٹی پبلی کیشن۔ ۱۹۸۲ء
- غالبؔ (عظیم فارسی اُردو شاعر پر پروفیسر مُجیب کے انگریزی مونوگراف کا کشمیری ترجمہ) ساہتیہ اکیڈمی پبلی کیشن ۱۹۸۵ء
- کُشپر بالہ اپارِ (صوبہ جموں میں رہائش پذیر کشمیریوں کی ثقافتی تاریخ) کشمیر یونیورسٹی پبلی کیشن۔ ۱۹۸۹ء
- رسا جاودانی (نامور اُردو اور کشمیری شاعر کی زندگی اور کارناموں پر مانوگراف) ساہتیہ اکیڈمی پبلی کیشن ۔ ۱۹۹۲ء
- سروجنی نائیڈو (مشہور بُلبلِ ہند کی زندگی اور کارناموں پر پدمنی سین گپتا کے انگریزی مانوگراف کا کشمیری ترجمہ) ساہتیہ اکیڈمی پبلی کیشن ۱۹۹۳ء
- قاضی نذرالاسلام (بنگال کے باغی اور انقلابی شاعر کی زندگی اور کارناموں پر گوپال ہالدار کے انگریزی مانوگراف کا کشمیری ترجمہ) ساہتیہ اکیڈمی پبلی کیشن ۱۹۹۳ء
- کشمیر میں اسلام، تصوف اور فارسی زبان وادب کی تاریخ (۱۳۳۹ء تا ۱۵۵۵ء) پی ایچ ڈی تھیسس۔ (غیر مطبوعہ)
- بیادِ امین (ایک عاشقِ اقبال کی حیات کا تذکرہ) اقبال اکیڈمی پبلی کیشن ۱۹۹۴ء
- خزینۂ امین (ایک عاشقِ اقبال کی پچپن سالہ زندگی میں زیرِ مطالعہ رہی تفصیلات کا حاصلِ مطالعہ) اقبال اکیڈمی پبلی کیشن ۱۹۹۶ء
- کشمیر شناسی (کشمیریوں کے اجتماعی لاشعور اور مشترکہ تہذیبی ورثے کی روح اُجاگر کرنے والے مقالات) (غیر مطبوعہ)
- سرینگر تا سمرقند (مہتا شیر سنگھ کی پیدل طے کردہ مسافت پر مبنی سفرنامے کا انگریزی ترجمہ (غیر مطبوعہ)
- خواجہ غلام رسول کامگار (کشتواڑ کے مشہور کشمیری و اُردو ادیب کی زندگی اور کارناموں پر مانوگراف) ساہتیہ اکیڈمی پبلی کیشن ۱۹۹۷ء
- اعما عبدالرحیم (بانہال کے اولین اہم کشمیری شاعر کی زندگی اور کارناموں پر مانوگراف) ساہتیہ اکیڈمی پبلی کیشن ۱۹۹۸ء
- ولی احمد مؤت (بڈگام کے مشہور کشمیری شاعر کی زندگی اور کارناموں پر مانوگراف) ساہتیہ اکیڈمی پبلی کیشن ۱۹۹۹ء
- قدیم کاشُر (کلام شیخ العالمؒ کا ہمہ گیر ثقافتی ولسانی پس منظر (بہ اعانت سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز، میسور ۲۰۰۱ء
- کلام اقبال کے روحانی، فکری وفنی سرچشمے (مقالات) ۲۰۰۴ء
- آدم گریٔ اقبال (علامہ اقبال کے نظریات اور فنی نکات پر مقالات) ۲۰۰۴ء
- کشمیری املا نامہ (کشمیری زبان میں رائج عربی، فارسی، تُرکی اور سنسکرت الفاظ کی معیار بندی (غیر مطبوعہ)
- انہار۔ شعبۂ کشمیری (کشمیر یونیورسٹی کے دس خاص نمبر بشمول شیخ العالم نمبر، گریرسن نمبر، محمود گامی نمبر، نعتیہ ادب نمبر و مشرقی شعریات نمبر) ۱۹۸۶ء تا ۱۹۹۷ء
- تجلستان (دوسرا شعری مجموعہ جو ۱۹۹۰ء میں ترتیب دیا گیا تھا لیکن اب تک غیر مطبوعہ رہا)

Auto Finance
Consumer Finance
Insurance
Housing Finance
Education Loan
Personal Loans
Depository & Share Broking Services
Bank on us
...because growing needs require a growing bank.
Your needs make us the fastest growing Bank in India. With a network of over 479 branches offering a range of value added services and products to the traditional as well as the techno savvy banking customer. Anytime Banking, TeleBanking, ATMs, Global Access Debit Card (Maestro and Cirrus) and other enabled services make doing business with us a pleasure. Internet and Mobile Banking launching soon. Our strongest currencies are Service and Commitment. The biggest reward: your Trust.
A vision of the future, coupled with a commitment to fulfil customer needs, takes J&K Bank to newer heights.
THE JAMMU AND KASHMIR BANK LTD.
Anywhere Banking from... Kashmir to Kerala
Corporate Headquarters: Maulana Azad Road, Srinagar - 190 001, Kashmir
Visit us at: www.jkbank.net www.jkbank.org

کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں ۱۹۹۷ء کے نیشنل سیمنار کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر مرغوب درمیان میں ہیں۔ اُنکی بائیں طرف پر سابقہ وائیس چانسلر پروفیسر حامدی کاشمیری نئے وائیس چانسلر پروفیسر ایم۔ وائی قادری اور انچارج سیمنار ڈاکٹر حیات عامر ہیں۔ جبکہ اُنکی دائیں طرف پر صدر شعبۂ فارسی پروفیسر ایم۔ ایس نیاز مند، بزرگ شاعر سیفی سوپوری اور ہیڈ کمپیوٹر ڈپارٹمنٹ پروفیسر پیر مُشتاق ہیں یہ تمام حضرات دیگر سامعین کے ساتھ اُنکے خیالات پوری توجہ سے سُن رہے ہیں۔